کیسے سمجھاؤں

واجدہ تبسم

کیسے سمجھاؤں

واجد تبسم

رابعہ بک ہاؤس
بخشی مارکیٹ ○ انار کلی لاہور

جملہ حقوق محفوظ ھیں

ناشر ــــــــ خورشید اے شیخ
ادارہ ــــــــ رابعہ بک ہاؤس
مجلد اول ــــــــ سنہ ۱۹۶۷ء
تعداد ــــــــ گیارہ سو
مطبع ــــــــ محمد سعید بٹ۔ رینا آرٹ پریس لاہور
قیمت ــــــــ -/۹ روپے

پھانس

"کسی بھی حالت میں فوراً پہنچ جاؤ ___!"
تار ملتے ہی شازی کی حالت غیر ہوگئی ___ تار بھیجنے والے کا نام انور تھا، یقیناً یہ تار اس کے پیاری باجی، نکہت کے میاں کی طرف سے تھا ___ انہوں نے کوئی اشارہ تک نہیں دیا تھا کہ کیوں اسے فوراً پہنچ جانے کیلئے کہا گیا ہے، لیکن اس کا دل رہ رہ کر گواہی دے رہا تھا۔ کہ "یقیناً باجی کی حالت نازک ہے ___ میرے منہ میں خاک ___ وہ بستر مرگ پر ہیں ورنہ ___ ورنہ کبھی انور بھائی ایسا تار نہ دیتے ___"
اس صورت میں کہ شادی کے بعد کئی سال گزار لینے کے باوجود آج تک دونوں بہنوں میں کسی قسم کی خط وکتابت نہ تھی اور نہ کبھی ملی ہی تھیں۔

عورت سارے رستے بھول جاتی ہے، لیکن زندگی بھر ایک راستہ کبھی نہیں بھولتی ___ میکے کو جانے والا راستہ؛

پھلواری چاہے کتنی ہی گندی ہو، اس کے پاس سدا پھولوں کی خوشبو آتی ہے، یہی حال میکے کا ہے، میکے میں عورت نے، لڑکی کے روپ میں کیسی ہی تکلیفیں اٹھائی

ہوں، میکے کی یادیں کتنی ہی سنگین کیوں نہ ہوں، پھر بھی ان کانٹوں میں سدا ایک پھول مہکتا رہتا ہے ــــ یادوں کا پھول! ــــ سدا بہار پھول !!

غازی تار پاکر تڑپ اٹھی ــــ اس کے میکے کی بھولی بسری نشانی لے دے کے صرف ایک باجی ہی تو رہ گئی تھیں ماں باپ کبھی کے اللہ کو پیارے ہو چکے تھے، ایک بھائی، تھا جو بچپن ہی میں ختم ہو چکا تھا۔

یادوں کا تمام تر مرکز صرف باجی تھیں، لیکن کس قدر عجیب بات تھی کہ وہ دل و جان سے اتنا چاہنے کے باوجود کبھی نکہت سے مل سکی نہ خط و کتابت کا ذریعہ ہی باقی رہا بات کچھ بھی نہ تھی، بہت سالوں پہلے جب نکہت بیاہی جاچکی تھی، امی ابا دونوں زندہ تھے ــــ

شازی ابھی تعلیم حاصل کر رہی تھی کہ اس کے لئے اقبال کا پیام آگیا۔ نکہت اس پیام پر سخت معترض تھی ــــ

کا ہے کہ ہم تمہارے برے بھلے کے بارے میں سوچیں، اور شازی! یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ہم خالہ بی کے پالے ہوئے لڑکے سے تمہاری شادی کر دیں "

خود شازی کا اپنا یہ خیال تھا کہ کم سے کم باجی کی طرح بی اے تو کر ہی لے۔ بری گھڑی پوچھ کر نہیں آتی اللہ نہ کرے کبھی برا بھلا وقت آگیا تو اتنی تعلیم تو رہے کہ نوکری کر کے اپنا پیٹ آپ پال سکے ــــ

لیکن اقبال کی دیوانی محبت کچھ بھی نہ ہونے دیتی ــــــ!!
ایک دو دن ٹلے نہیں کہ وہ اپنی لمبی سی گاڑی لے کر آن موجود!
وہی تاک جھانک کا سلسلہ ــــــ وہی راستہ روک کر ہلکی سی چھیڑ چھاڑ ــــــ

کبھی اس کمرے سے اس کمرے میں جانے تک شازی کو روک لینا اور اظہار محبت کر ڈالنا ــــــ "یقین کرو شازی میں خودکشی کر لوں گا ــــــ اگر تم نے ہاں نہ کی!"

باجی سے یہ ساری باتیں پوشیدہ نہ تھیں، خیر محبت کی سرگوشیاں وہ نہ بھی سنتیں لیکن دن رات تحائف جو چلے آ رہے ہیں، کبھی قیمتی ساڑیاں، کبھی جڑاؤ زیور (جو شازی کی کمزوری تھے) کبھی فارن کی خوشبوئیں ــــــ

کبھی اس اعتراف کے ساتھ میک اپ کا سامان کہ شازی تم تو خود ایک حور ہو تمہیں میک اپ کی بھلا کیا ضرورت ہے؟"
یہ ساری باتیں تو وہ خود کھلی آنکھوں دیکھ رہی تھیں۔

انہیں اصل اعتراض اقبال کے چھچھورے پن پر تھا، پیسہ پاکر کوئی یوں اپنی اوقات نہیں بھول جایا کرتا، امّی ابا کو ذاتی طور پر قطعاً کوئی اعتراض نہ تھا، آنکھوں کے سامنے پلا بڑھا اچھے خاندان کا لڑکا تھا، بازار سے کوڑی پھیر کر کے سودا سلف لایا تھا۔

دھوبیوں کی طرح دھنا دھن گھر بھر کی غلاظت سے بھرے کپڑے دھوتے تھے، اور گھر پر تو ماسٹر صاحب پڑھانے آتے تھے ان کے آگے بیٹھ کر ہل ہل کر قرآن مجید

بڑھا تھا۔
ہوتے کھا کھا کر جھوم جھوم کر آگے پیچھے ڈول ڈول کر ا۔ب۔ت سے شروع کر کے پورا قاعدہ ختم کر ڈالا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے پانچویں جماعت میں داخلہ لے لیا تھا اور پھر ایسا بڑھا ایسا بڑھا کہ کسی کے پیسے کی حاجت رہی نہ ہاتھ پھیلانے کی۔
ہر کلاس میں پہلا نمبر آنے پر وظیفہ ملتا رہا اور بی۔اے کر کے جب اس نے خالو صاحب کو سلام کیا تو انہوں نے خوش ہو کر پانچ سو روپے انعام دیئے۔ اسی پانچ سو سے اس نے سامان کی چھوٹی سی دوکان ڈال لی ـــــ
جو بڑھتے بڑھتے "اقبال اینڈ سنز" بن گئی پہلے پہلے خاندان بھر میں اس "اینڈ سنز" پر بڑی ہنسی اڑی مگر اقبال نے بڑی خوش دلی سے جواب دیا ـــــ "ارے باپ موجود ہے تو بیٹے بھی آہی جائیں گے!"
پہلے دوکان میں ایک نوکر بڑھا، پھر دوسرا نوکر آیا پھر دکان وسیع کی گئی۔ پھر فون آیا، پھر گھر خریدا گیا۔ پھر گھر میں فون لیا گیا، پھر فرج کی باری آئی۔
لیکن گھر چھوٹا محسوس ہوا تو بڑی سی جگہ خرید کر خوبصورت سا بنگلہ بنوایا گیا۔ پھر گاڑی آئی، پھر چھوٹی کی بجائے لمبی گاڑی آئی۔ پھر آنکھوں میں حسین خواب تنے خوابوں میں ایک حسین پیکر آیا ـــــ
وہ حسین صورت جس پر دل بچپن سے فدا تھا ـــــ جسے

دیکھنے سے آنکھوں میں ٹھنڈک بھر جاتی تھی اور دل پھول کی طرح کھِل اٹھتا تھا۔ جب ویسے ساتھ ہوں تو انسان چاہے پر بھی ہاتھ ڈال سکتا ہے ـــــ پھر شازی تو اسی زمین کا چاند تھی ـــــ

اور لڑکیاں ہوتی ہی اسی لئے ہیں کہ خوبصورت ہوں پڑھی لکھی ہوں، دنیاوی آداب سے آشنا ہوں تو اچھے برے لڑکے آئیں اور بیاہ لے جائیں۔

پھر اقبال میں کون سی کمی تھی ـــــ ؟

یہ سب باتیں امی ابا سوچتے تھے، لیکن پتہ نہیں نکہت کے دل میں کون سی گرہ تھی جو کھٹکتی ہی چلی آتی تھی۔ وہ خود بی اے پاس تھی، خوبصورت تھی، دو پیارے پیارے ـــــ بچوں کی ماں تھی۔ لیکن وہ جو بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ "اولاد مرد کے نصیب سے، دولت عورت کے نصیب سے!"

تو یہ تو خدا کا شکر تھا کہ اس نے صاحب اولاد کیا تھا کہ ایک لڑکی، ایک لڑکا، دو دو پھول عنایت کر دیئے تھے، لیکن جہاں تک دولت کا تعلق تھا وہ بس یونہی سی تھی، الو کسی دفتر میں تین سو روپے پاتا تھا۔ اور یہ روپے کھاتے پیتے برابر ہو جاتے تھے۔

نکہت کو گھر کا کام کاج خود کرنا پڑتا تھا۔ کبھی چولہے میں گھسی ہوتی ہے، کبھی بچوں کو سمیٹ رہی ہے، میاں کے دوست آجائیں تو خاطر داری کو لپک رہی ہے۔ ایسے میں بچوں کا شور شرابہ، رونا دھونا سکون برباد کر دیتا ـــــ

اقبال کے یہاں کی زندگی تقریباً مغرب زدہ تھی، لمبی سی میز تھی۔ کھانے والا دہی ایک تھا، مودّب بیرا کھانے تک سروس بجاتا رہتا ـــــــ پھر آئے دن کی پارٹیاں تھیں جن میں وہ خاندان کے سبھی لوگوں کو بلاتا، جن جن کا نمک کھایا تھا، سبھی کو مدعو کرتا ـــــــ اور منہ در منہ ہوتی ہوئی باتیں یہاں سے وہاں تک پھیل جاتیں کہ اقبال تو ایسی زندگی گزار رہا ہے کہ بس ـــــــ!

نکہت نے جب کمر ہی باندھ لی کہ اس پیام کو رد کرنا ہی ہے تو شازی کی بھی آنکھیں کھلیں ـــــ کون لڑکی ایک محبت بھرے دل کے ساتھ زندگی کا عیش و عشرت نہیں چاہتی، پھر باجی اس آڑ کو لے کر کیوں بیٹھ گئی ہیں کہ وہ کبھی نہ ملنے میں پالا ہوا لڑکا تھا۔

اچھی لڑکی پانے کے لئے تعلیم، شخصیت، وجاہت، دولت اور محبت کے ساتھ ساتھ جو رکھ رکھاؤ ضروری ہوتا ہے وہ سب تو اقبال میں موجود ہے۔ ایسی بے پناہ چاہت پھر پتہ نہیں، نصیب ہو یا نہ ہو، ایک دن اقبال آکر گیا ہی تھا، پاس وہ پیکٹ بھی پڑا ہوا تھا جو شازی نے ابھی کھول کر دیکھا تک نہیں تھا، نکہت ادھر سے گزری تو شازی نے پاس پڑا تکیہ اٹھا کر اس پر رکھ دیا۔

نکہت چڑ کر بولی ـــــــ

"امی ابا بھلے ہی اتنے روشن خیال ہیں تو ہو لیں کہ کسی، کنوارے غیر لڑکے کا آنا جانا، لین دین، ہنسی مذاق مائنڈ نہ

سکر ہیں۔ لیکن شازی! میں ان باتوں کو اچھا نہیں سمجھتی۔"
شازی نے بڑی بڑی خوابناک آنکھیں اٹھا کر کہا۔
"غیر ـــــ؟ باجی! جب کوئی لڑکی کسی لڑکے کو اپنے من مندر کا دیوتا بنا لیتی ہے تو کسی طرح کی غیریت باقی نہیں رہ جاتی، میں اقبال کو اپنا شوہر مان چکی ہوں!"
دونوں بہنوں میں آج تک اس طرح کی کوئی بات نہ ہوئی تھی اور جو ہوئی تو ایسی کہ کسی قسم کی کوئی جھجک ہی باقی نہ رہی ـ اتنی دیدہ دلیری سے شازی نے کیسے اس کے سامنے ایسی بے حجابانہ باتیں کر دیں ـــــ؟
اس کی شادی تو ماں باپ نے طے کی تھی، اس نے تو دخل تک نہ دیا تھا۔ پھر یہ شازی کس طرح ایسی آزاد ہو گئی؟"
نکہت نے بے حد غصہ کے ساتھ تقریباً چلا کر کہا۔
"شازی! تم بھول رہی ہو کہ میں تمہاری بڑی بہن ہوں اور یہ کہ ہماری مشرقی تہذیب کے اپنے چند اصول ہیں، کیا تم ایک ایسے لڑکے کو بطور شوہر قبول کر کے خوش رہ سکو گی، جس نے دعوتوں میں بارہا تمہارے جھوٹے ہاتھ دھلائے ہیں ـــــ؟
نکہت نے سوچا تھا شازی اس طرح گرا کر یاد دلانے سے اقبال کا بچپنا سوچ کر بھڑک اٹھے گی۔ لیکن اس نے بے حد پیار سے جواب دیا۔
"باجی! وہ ہاتھ جو آج اتنی محبت سے میری طرف بڑھے ہیں بچپن سے ان آنکھوں کے سامنے رہے ہیں ـــــ اور پیار

سے جو ہاتھ آگے بڑھتا ہے وہ حقیر نہیں بے حد عظیم ہوتا ہے!"

نکہت حیران رہ گئی کہ شازی اپنے فیصلے پر نظر ثانی کبھی نہ کرے گی۔ نہ وہ بچی تھی نہ جاہل، اپنا برا بھلا خود بھی تو سمجھ سکتی تھی۔

وہ نکہت کی بے بنیاد سی بات کو کہ اقبال کا ماضی ذلیل تھا. کسی صورت سے ماننے کو تیار نہ تھی۔ نکہت اسی دن یہ فیصلہ سنا کر اپنے سسرال چلی گئی کہ ــــــ

"میں ایسی شادی میں شرکت کر کے خود کو ذلیل نہیں کرنا چاہتی جہاں نوکروں کو دامادوں کا درجہ دیا جائے ــــــ اور نہ اب میں کبھی شازی سے ملنا ہی پسند کروں گی!"

دن کیسے بیت جاتے ہیں ! ہوا کی مانند ــــــ ان کے بھی جو عیش و عشرت میں مگن ہوتے ہیں اور اُن کے بھی جن کی زندگی کی کتاب کا ہر ہر ورق مصیبتوں اور کلفتوں سے عبارت ہوتا ہے۔ ان تمام سالوں میں دونوں بہنوں میں کسی طرح کی خط و کتابت رہی نہ وہ ملیں ہی ــــــ دنیا کا کوئی سکھ ایسا نہ تھا جو شازی نے اٹھا نہ لیا ہو، تین پیارے پیارے بچوں کی وہ ایک خوش ترین ماں تھی، جس میں ایک گڑیا سی بیٹی اور دو بیٹے تھے۔ اس طرح اقبال اینڈ سنز واقعی اقبال اینڈ سنز بن چکی تھی ــــــ

سکھوں کے ہنڈولے میں جھولتی ہوئی شازی کبھی کبھی دل میں ایک کسک سی محسوس کرتی ــــــ میکے کی تڑپ، شوہر

کا بے پناہ پیار اسے میسّر رہا کئے تھے۔ شاندار وبُر وقار کوٹھی، ہر جدید فیشن اور فرنیچر سے آراستہ، پہننے کے لئے بے پناہ حسین ملبوسات، گہنے، جواہرات، سواری کے لئے دو دو خوبصورت کاریں اور میاں کی وہ چاہت کہ نئی نویلی دلہنیں رشک کریں، عیش و آرام نے عورت کو بوڑھاپے کا راستہ نہیں بتایا۔ بتایا ہے تو شوہر کی عدم توجہی، بے قدری، غربت وافلاس اور بدلی ہوئی نگاہوں نے ______

اسی لئے شازی اتنے سال گزر جانے پر بھی اسی طرح شاداب، جوان اور امنگوں سے بھرپور تھی، جیسے ڈالی پر کھلا ہوا تازہ تازہ گلاب، ان تمام باتوں کے ہوتے بھی کبھی کبھی شدت سے اس کا جی جاتا،

اپنے بیٹے کی ایک ہی نشانی، باجی سے ملے۔ باجی سے خوب باتیں کرنے ۔ باجی کے ہاں جائے، انہیں اپنے ہاں بلائے،______ ______، انہیں تحفوں سے لاد دے، انہیں ہر ممکن خوشی دے ___

بے حد خلوص سے اور محبت کے ساتھ انہیں یہ بھی بتلائے کہ ــ "دیکھئے باجی آپ کے تمام تر خدشے کتنے بے بنیاد ثابت ہوئے ___ آپ کو یہ فکر تھی کہ اقبال چھوڑ رہا ہے، وہ مجھے خوش نہ رکھ سکے گا، زیادہ دولت ہاتھ آئی ہے۔ مجھے چند روز بعد مسلی ہوئی کلی کی طرح پھینک دے گا اور نئے نئے دساتھی عیش و طرب کے لئے ڈھونڈ لے گا۔ کتنے سارے خدشات آپ کو تھے ___

دیکھئے! اقبال نے مجھے کس طرح خوش رکھا ہے، کس طرح میرے دل کو اپنی محبت سے اور اپنے دل کو میری محبت سے بھر رکھا ہے کہ کہیں بھی زندگی میں ہلکا سا دکھ کا نام و نشان تک نہیں۔

اسی محبت کی فراوانی نے میری جوانی کو کبھی نہ مرجھانے والا سدا بہار پھول بنا دیا ہے۔ !"

وہ یہ سب سوچتی لیکن اتنی ہمت نہ پاتی کہ خط لکھے یا انہیں بلالے۔

سوچتی اگر باجی نے دھتکار دیا یا میرا محبت بھرا بلاوا قبول نہ کیا تو میں برداشت نہ کر سکوں گی ۔۔۔ اقبال بھی شاید اچھا نہ سمجھے۔

اور آج ۔۔۔

اور آج اچانک اسے میکے سے بلاوا آگیا۔ لیکن اس کے دل نے اسے آگاہ کیا، یہ خوشی کا لمحہ نہیں ہے، یہ بری گھڑی ہے۔ اس کا دل رہ رہ کر کہہ رہا تھا۔ کچھ ہونے والا ہے ۔۔۔ تار ہاتھ میں لئے، کتنی ہی دیر تو وہ یونہی کھڑی ماضی کی ہر ہر بات سوچا کی۔ پھر ایک دم تیزی سے اقبال کے کمرے کی طرف دوڑی ۔۔۔

"اقبال ۔۔۔ پلیز اقبال جلدی کرو، ہمیں فوراً جانا ہے!"

اقبال ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا ہوا شازی ڈیر ؟ اتنی گھبرا کیوں رہی ہو ۔۔۔ ہوا کیا ؟"

اک دم شازی بچوں کی طرح رونے لگی ــــ "اقبال! باجی کی طبیعت بے حد خراب ہے، دیکھو انور بھائی نے بلایا ہے۔"

اقبال اس کی تسلی کے لئے ہنس کر بولا ــــ "تم تو پاگل ہو میری جان! اس تار سے یہ مطلب کہاں نکلتا ہے کہ اللہ نہ کرے باجی علیل ہیں ؟"

"اقبال ــــ بعض باتیں دل خود سمجھا دیتا ہے تم چلو ابھی چلو پلیز !"

"لیکن اتنے سالوں میں کیا پتہ انور صاحب کا تبادلہ کہیں اور ہو چکا ہو۔ ہمیں ان کا پتہ بھی تو نہیں معلوم، پہلے تو شاید وہ کلکتے ہوا کرتے تھے۔"

"میں نے تار پر دیکھ لیا ہے وہ کلکتے ہی سے آیا ہے، تم پلیز فوراً پلین سے سیٹیں بک کروالو!"

"میری جان! پریشانی میں تم بالکل بد حواس ہو رہی ہو بغیر ریزرویشن کے ہم اس طرح کیسے ٹکٹ حاصل کرسکتے ہیں ذرا تو سوچو۔ ٹھہرو میں پہلے کال کرلوں ــــ"

جب تک اقبال ٹیلیفون پر بات کرتا رہا شازی کئی بار مری اور کئی بار جی۔

بستر پر ہڈیوں کا ایک ہار سا پڑا ہوا تھا۔ جسے پہچاننے میں شازی کو دیر نہ لگی۔ اُف! اس کی پھول جیسی باجی! اس نے آنسوؤں کو آنکھوں ہی میں پی لینے کی ناکام سی کوشش

کی ــــ

"انور بھائی ـــــ باجی کی ایسی حالت کب سے ہے ؟
آپ نے مجھے پہلے سے اطلاع تو دی ہوتی کبھی ــــــ "
انور پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولا ــــــ " وہ اطلاع
دینے دیتی تب نا ـــــ ؟ ڈاکٹرز ، نے آخری اسٹیج بتایا ہے

میں نے سوچا اب تو آپ کو اطلاع دے ہی دوں "،
وہ حالات کے ہاتھوں خاصا بے حس ہو گیا تھا ، بے حد
احساسات سے عاری لہجہ میں وہ نکہت کی بیماری کی تفصیل دیتا
رہا ـــــ اتنے میں نکہت نے آنکھیں کھول دیں ـــــ ادھر
ادھر دیکھ کر پھر سے موند لیں۔
وہ کہہ رہا تھا ـــــ
"کئی بار ایسا ہو چکا کہ معلوم ہوتا ہے آخری لمحہ آ گیا لیکن
جانے کون سی پھانس ان کے دل میں اٹکی ہوئی ہے کہ پھر
وہی حالت ، وہی تکلیف ، وہی حالت ہو جاتی ہے ، لیکن مشکل
آسان نہیں ہو چکتی "
شازی نے کمرے پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی ، انتہائی
غربت کا مظاہرہ ہو رہا تھا ۔ تین سو روپے پانے والا شوہر
اتنی طویل بیماری سے اگر یوں اکتا جائے تو شاید بے جا نہیں
اس نے لرز کر سوچا ـــــ
نکہت نے ایک بار اور آنکھیں کھولیں اور جیسے شازی
کو بہت کوشش سے پہچان کر دھیمے دھیمے بولی۔
"ارے ـــــ تو ـــــ شازی ..... ؟"

شازی اس پر جھکی، آنسوؤں کے مارے بات نہ نکلتی تھی۔

"ہاں باجی! انور بھائی نے مجھے تار دیا اور میں اڑی چلی آئی ــــ اب آپ....." لیکن نکہت نے بات کاٹ کر دھیمے سے پوچھا۔

"اڑی چلی آئی ــــ؟ پلین سے ــــ؟ لیکن مجھے تو..... کسی نے بتایا تھا کہ..... اقبال کی فرم ڈوب گئی ..... وہ دیوالیہ ہو گئے ..... پھر....."

اک دم شازی کی آنکھوں سے بادل ہٹ گئے، وہ سکون کا سانس لے کر بولی۔

"باجی ــــ آپ نے غلط نہیں سنا تھا۔ واقعی ہم دیوالیہ ہو گئے زندگی میں بہت سکھ اٹھالیا تھا باجی! اسی کی یہ سزا تھی ....."

نکہت کے چہرے پر ایک جوت سی جاگی ــــ "پھر اقبال اب..... کیا کرتے ہیں..... غریبی کے ہاتھوں، پریشان ہو کر..... وہ تم سے اچھا سلوک تو نہ کرتے ہوں گے؟"

شازی نے اس کے ماتھے پر بے حد پیار سے اپنا ہاتھ رکھ دیا ــــ "باجی بس یہ سمجھ لیجئے زندگی ہے، گزارنی پڑ رہی ہے وہ پیار محبت تو ایک خواب تھا جو بیت چکا ــــ"

اب اقبال اور انور باہر جا کر باتیں کرنے لگے تھے، اقبال شازی کے اچانک بدلے ہوئے رویے سے سخت بدحواس

ہوکر باہر نکل گیا تھا۔ انور بھی اسی کے پیچھے لپک پڑا تھا۔
انہیں جاتے دیکھ کر نکہت نے آخری سوال بہت مشکل سے
ادا کیا ــــ "تمہارے بچے ــــ سنا تھا، تین بچے کہاں ــــ
ہیں ــــ لائیں نہیں ؟"

شازی بے چارگی سے بولی

"باجی اتنا کرایہ کہاں سے لاتی کہ سب کو ساتھ لے آتی ــــ
ــــ ، پڑوسن کے ہاں چھوڑ آئی ہوں ــــ" (اس
کی آنکھوں میں اپنے تینوں موٹے تازے صحت مند شریر بچے
گھوم گئے جو اپنی آپا پر لدے ہوئے ہوں گے ــ!)
نگہت کے چہرے پر اک نور سا چھا گیا۔ اس نے آخری
بار بہت محبت سے شازی کے چہرے کی طرف دیکھا اور کہا۔
"ہم دونوں ہی ایک کشتی کی سوار ہیں شازی! ہم...
دونوں ہی......"

اور اک دم دیکھتے ہی دیکھتے ایسی آسانی سے اس کا دم
نکل گیا جیسے غبارے میں سے ہوا نکل جائے ــــ!

شازی کی چیخوں کی آواز سن کر دونوں مرد کمرے میں لپکے
ہوئے آئے۔ انور نے سفید چادر نکہت کے چہرے تک کھینچ دی۔
اقبال شازی کو سنبھالتا ہوا کمرے کے باہر لے آیا۔ وہ اسے چمکارتا
ہوا بولا ــــ "شدید غم نے تمہیں بدحواس کر دیا ہے شازی چلو
ذرا کھلی ہوا میں سانس لو اور مجھے یہ بتاؤ تم نے نکہت باجی سے"
شازی سسک اٹھی ــــ "تم نہیں سمجھو گے اقبال! تم نہیں
سمجھ سکو گے ــــ میں نے باجی کے سینے سے وہ پھانس نکال دی ہے

جس نے انہیں سکون سے مرنے سے روک رکھا تھا.... میں یہ سب نہ کہتی تو وہ کبھی سکون سے نہ مرپاتیں....،،
اقبال واقعی کچھ نہ سمجھ سکا ——!!

تصویریں

ابھی ابھی چوتھی بار ٹیلیفون کی گھنٹی بجی ہے، اور میں نے اپنے تھرتھراتے ہاتھوں میں ریسیور تھام لیا ہے. ریسیور منہ کے قریب لے جاکر میں نے کانپتی آواز سے "یس پلیز" کہا ہے، اور پھر میری آنکھیں بھیگ گئی ہیں. میں نے گھبرا کے ریسیور رکھ دیا ہے اور پھر میرے ذہن میں کئی تصویریں ابھرنے لگی ہیں.

سامنے ہی ٹیبل پر میری تصویر رکھی ہے جو ریاض نے کھینچی تھی، میرے جسم پر سرخ پھولوں والی ساری ہے، جو تصویر میں کالی دکھائی دے رہی ہے،

میں ٹیبل پر دونوں کہنیوں کے بل جھکی ہوئی ہوں. اور ریسیور میرے منہ سے لگا ہوا ہے. میرے چہرے پر مسکراہٹ ہے، لیکن نہ جانے میں کیا کہہ رہی ہوں، .... کہیں تصویریں بھی بولتی ہیں۔ ؟؟؟

لیکن یہ تصویریں کیسی ہیں. جو میرے ذہن کے پردوں

پرابھر رہی ہیں۔ یہ بھی تو تصویریں ہی ہیں۔ پھران میں قوت گویائی کہاں سے آگئی ؟ کیسے آگئی ؟ یہ تو رنگارنگ تصویروں سے سجا البم ہے ! میں نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے اس البم کے ورق الٹنے شروع کر دیئے ہیں !

میری نگاہوں کے سامنے مارچ اپریل کی ایک خوش گوار سی شام بھولا سی جھول رہی ہے۔
باہر کورٹ میں رانی، شمتہ، دکی اور میں بیڈمنٹن کھیل رہے تھے۔ ڈیڈی پاس کرسی ڈالے ہم لوگوں کا کھیل دیکھ رہے تھے۔ کہ اتنے میں ڈرائینگ روم سے فون کی گھنٹی سنائی دینے لگی۔ ڈیڈی نے پہلے تو اپنے بھاری بھرکم جسم کی طرف دیکھا پھر پیار سے بولے۔
" بلی ؛ ذرا فون تو ریسیو کر لے بٹیا !"

میں ریکٹ لئے لئے ڈرائینگ روم میں دوڑ گئی، سانس برابر کر کے میں نے ریسیور اٹھایا، اور بہت ملائم سی آواز سے کہا ـــــ !
" یس پلیز !"
" ہائے مار ڈالا !"
اک دم دوسری طرف سے بے ساختہ آواز آئی، میں گھبرا سی گئی، شاید رونگ نمبر مل گیا ہو،
" ہلو ـــ !" میں جلدی سے بولی۔

اب کی بار مطلع صاف ہو گیا ـــــ "کیا سویٹ آواز ہے خدایا !"

میں تیزی سے بولی "یہ کیا بدتمیزی ہے ؟"

اُدھر سے آواز آئی ـــ "بدتمیزی نہیں صاحب ! آواز ہی ایسی پیاری ہے !"

میں غصہ دبا کر بولی

"سیدھی طرح کہئے، کس سے بات کرنی ہے آپ کو ؟"

ہنسی کی مدھم آواز کے ساتھ سنائی دیا ـــ "پہلے تو چاچاجان سے کرنی تھی، لیکن اب تو بس آپ ہی سے کر لوں گا۔"

"آپ انتہائی بدتمیز آدمی ہیں !"

میں غصہ سے کانپ گئی۔

"شکریہ !" ہنسی کی کھنک۔

"اچھا دیکھئے !" میں سنجیدہ ہو کر بولی "اپنا نام بتائیے اور جو کچھ کہنا ہے جلد کہئے، میرے پاس بے کار وقت نہیں ہے، ڈیڈی سے ملنا ہو تو بولیں کہہ دیجئے !"

پھر ہنسی کی آواز سنائی دی۔

"پہلے اپنا نام بتا دیجئے !"

"بی ـــ !" میں نے عاجز ہو کر کہہ دیا۔

"اوہ بی ! تب تو پھر میں یقیناً بلا ہوں، میاؤں، میاؤں !!"

اور لائن کٹ ہو گئی۔

ابھی میں باہر نکلی ہی رہی تھی کہ پھر گھنٹی بجی، میں

نے ریسیور اٹھالیا۔

" جی میں یہ کہنا بھول گیا تھا کہ اب سے جب کبھی میں فون کروں تو آپ ہی ریسیو کیا کیجئے، میرا نام ریاض ہے ۔ کیا سمجھیں محترمہ ۔ "

" کس کا فون تھا بیٹی ؟ " ڈیڈی نے پوچھا

" کوئی ریاض صاحب تھے ، خیریت پوچھ رہے تھے " باقی ساری باتیں پی گئی۔

" اچھا ۔ ریاض ۔ ا ہو ہو ہو ۔ شریر لڑکا ، روزانہ خواہی نخواہی فون کرتا رہتا ہے " ڈیڈی بے ہنگم قہقہے لگانے لگے ۔

یادوں کی یہ شام کتنی سہانی ہے ، جیسے آبشاروں کا ترنم میری زندگی میں رچ بس گیا ہو۔

دکی اچک کر میز پر بیٹھ گیا اور آنکھیں نچا کر بولا

" اور آپی ؛ یہ تو بتائیے آپ ہمارے لئے کیا لائی ہیں علی گڑھ سے ؟ "

" جلے میں علی گڑھ پڑھنے کے لئے گئی تھی۔ تحفے بٹورنے کے لئے نہیں " میں مسکرا کر بولی۔

" اچھا یہ بات ہے ؛ تو دیکھ لیجئے اب کون اپنے ساتھ لے جاتا ہے آپ کو شاپنگ کے لئے ! "

" تو تم سمجھتے ہو میں اکیلی نہیں جا سکتی ؟ " اور میں نے اسے منہ چڑا دیا۔

" جا کیوں نہیں سکتیں صاحب ؛ مگر .... " وہ رک

کیا " اپنے ریاض بھائی آجائیں ذرا ، ایسے ایسے بہتوں کو ہم نے ٹھیک کر دیا ہے "

میں نے چونک کر اسے دیکھا

" ریاض بھائی ، ریاض بھائی کون ہیں ؟"

" ہونہہ ! بے چاری چار سال علی گڑھ میں کیا رہ آئی ہیں کہ سارے عزیزوں کو بھول گئیں ۔ تایا ابا کے لڑکے کو نہیں پہچانتی ہیں آپ ؟" اور وہ زور زور سے ٹانگیں ہلانے لگا ۔

" چار سال پہلے میں آئی تھی تو وہ جناب دلّی گئے ہوئے تھے ۔ یاد ہے ؟"

" جی ہاں یاد ہے " وہ ناک چڑھا کر بولا " مگر پھر بھی اتنا بنا بنا کچھ اچھا نہیں لگتا "

" ایسا بُرا بھائی کسی بہن کے نہ ہوگا " میں ذرا جھلّا کے بولی ۔ " بات کرنے کا ڈھنگ نہیں ، اور بہن بے چاری اتنی دور سے آئی ہے "

وہ میز سے اچک کر میرے گلے میں لٹک گیا ۔

" اچھی آپی ، پیاری ! لو بس اب تو خوش ہو "

میں ہنس پڑی

" ہاں ہاں خوش ہوں بابا ، مگر ذرا دور تو ہٹو دکی آپ کی بات کرو ذرا !"

" کیا ؟" وہ مستعد ہوگیا ۔

" بات یہ ہے کہ میری کامیابی اور واپسی پر بہت سامنے

لوگ پارٹی مانگ رہے ہیں، کیا ارادے ہیں؟"
"تو بس کرڈالیں۔ ڈر کا ہے کا؟"
"اتنے لوگوں کو دعوت دے گا کون؟ جن لوگوں کے یہں پہنچانی تک نہیں۔ اور اتنا سارا انتظام کون کرے گا؟"
میں ذرا پریشانی سے بولی۔
"اچھا؟"
اور وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شرارت سے ہنس پڑا۔
ہم سب مل کر مستعدی سے کام کرتے رہے بڑے ہال میں ہم نے اتی کی جہیز والی بڑی شطرنجی بچھا کر اس پر قالین بچھایا قرینے سے صوفہ سیٹ لگا کر کرسیاں لگائیں، دروازوں پر صوفہ سیٹ سے میچ کرتے ہوئے نیلے پردے لگائے۔
اسی کی مناسبت سے نیلے پھول ٹوکریوں میں سجا کر اسٹینڈ میں لگائے گلدان میں نیلے اور سرخ پھول بھر دیئے باورچی کو اچھی اچھی چیزیں پکانے کے لئے کہہ کر ہم سب لڑکیاں کپڑوں پہ ٹوٹ پڑیں۔
شمہ کا کہنا تھا میں ہرے رنگ کی وہ ساڑی پہنوں جس پر کالے رنگ کے بڑے بڑے پھول تھے، رانی کہتی تھی میرے رنگ پر سرخ رنگ خوب کھلتا ہے ادھر دکی صاحب کا اصرار تھا کہ میں بھورے سے رنگ کی وہ سلکن ساری پہنوں جس کا رنگ بالکل میری آنکھوں اور بالوں جیسا تھا۔

میں نے دکی کی پسند کی ہوئی ساڑی نکالی اور جب
ڈریسنگ کر کے میں باہر نکلی تو ستمہ نے ایک
آوازہ کسا۔

"آج تو سب کو جگر تھام کر بیٹھنا پڑے گا"

رانی نے اپنی شرمائی شرمائی ہنسی کے ساتھ کہا "آج
چاندنہ بھی نکلے تو بات بن جائے گی"۔

دکی بہت پیار سے بولا " اچھا تبھی کہ زیادہ ۔تادھنیں"
وہ اور بھی گھبرا گئی۔

"اف؛ یہ کیا مصیبت ہے میں تو کسی کو پہچانتی بھی
نہیں"

"واہ؛ دعوت آپ کے سلسلے میں اور ریسیو ہم کریں
اوں ہوں؛ یہ نہیں ہو سکتا!"

شمہ ایسے موقعوں پر ہمیشہ خود کو بچالے جاتی۔

"ارے میں تو آپ کے ساتھ رہوں گا، میں کس مرض
کی دوا ہوں؟" دکی سینہ ٹھونک کر بولا۔

پورچ میں ہم نے ہر طرف پھولوں کے گچھے سجا رکھے تھے۔
چار پانچ بجے سے کاروں کا سلسلہ شروع ہوگیا، ہال بھرتا
چلاگیا، مہمانوں کو ریسیو کرنے میں اور دکی کھڑے تھے اکدم
میری نظر سامنے والی باڑھ پر پڑی۔

"ہائے دکی؛ معلوم ہوتا ہے مالی وہ ڈالی کاٹنا بھول
گیا"

دکی زور زور سے ہنسنے لگا، واللہ آپی؛ کتنی مسخری معلوم

ہو رہی ہے وہ ڈالی !"

"اچھا تم ٹھہرو یہیں، میں اسے برابر کر کے آتی ہوں"
سیڑھیاں پھلانگ کر میں باغ میں پہنچ گئی، میں نے
ڈالی برابر کی، ہلنے کی وجہ سے چند پتیاں ٹوٹ گری تھیں
میں انہیں سمیٹنے کے لئے ذرا نیچے جھکی ہی تھی کہ اک دم ایک
کار آ کے رکی اور دکی بڑی گرمجوشی سے چیخا۔

" ہلو بھیّا !"

میں نے اس کے اس طرح شاندار استقبال کرنے پر گھبرا کر
سر اٹھایا۔ دکی وہیں سے چیخا۔

"ارے آپی ہو بھی چکا کام، واللہ آ بیٹے مقو۔

اجنبی نے مجھے پلٹ کر دیکھا۔

ایک لمحہ کو ٹھٹک سا گیا، اور پھر مسکرا کر دکی سے مخاطب
ہو گیا۔

"آپ کی تعریف ؟" اس کا اشارہ میری طرف تھا۔

"ہونہہ !" دکی اپنی شرارت سے باز نہ رہ سکا "تعریف
ہو ہی کیا سکتی ہے ! یوں مجھے بڑی بہن کا ارمان ہے تو دل رکھنے
کو انہیں آپی کہہ ضرور لیتا ہوں، ویسے سب کا کہنا یہ ہے کہ
ڈیڈی نے انہیں ایک بھوکی بنجارن سے دو سیر چاول میں
خرید ا تھا۔

"دکی ـــــ !!"

میں بے بسی سے چیخی۔

اک دم اجنبی نے مجھے ذرا غور سے دیکھا اور پھر دکی

سے پوچھا۔ "آپ کا نام ؟"
وہ تی زور سے ہنسا۔
"نام ؟ وہ تو آنکھوں، بالوں اور کپڑوں ہی سے ظاہر ہے
بھلا اس طرح کے مجموعے کا نام بلّی کے سوا اور کیا ہو سکتا
ہے ؟ ارے ریاض بھائی! آپ بھی کمال کرتے ہیں بس
کس کا ذکر لے بیٹھے، چلیے بھی اندر!"
"بلّی ـــــ!"
"ریاض ـــــ!"
ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دوسرے لمحہ وہ
اپنے لمبے لمبے قدم اٹھاتا، مسکراتا اندر چلا گیا۔ جاتے جاتے اس
نے سیٹی بجائی اور مڑ کر بولا۔
"میاؤں میاؤں!!"

کتنی نادان ہوں میں! میرا خیال تھا کہ شامیں سبھی حسین
ہوتی ہیں، خوبصورت قوس قزح کی طرح رنگین، لیکن
یہ بیتے دنوں کی بات ہے۔ اب تو جھلمل جھلمل آنسوؤں
کی چلمن سے مجھے وہ گئے دن نظر آتے ہیں تو میرا دل کٹ
کے رہ جاتا ہے۔ ذہن کے پردے پر یہ کیسی تصویر ہے
جو اتنے دن گزر نے پر بھی مدّھم نہیں پڑی، اس دن ہال،
بالکل کچا کچھ بھر گیا۔ بیٹھنے کے لئے جگہ ہی نہ تھی۔ مجھے بیٹھنا
بھی پڑا تو بالکل ریاض کی بغل میں۔

پاس بیٹھی ہوئی ایک خاتون نے ریاض سے میرا تعارف چاہا۔ وہ مجھے سنانے کے سے انداز سے بولا۔

"سنتا ہوں چچا کی بیٹی ہیں۔ ویسے جھوٹ سچ کا حال اللہ کو معلوم کیونکہ جب یہ یہاں تھیں میں یہاں نہ تھا۔ اور جب میں یہاں تھا یہ یہاں نہ تھیں"۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" وہ حیرت سے بولیں۔

وہ ہنس پڑا، وہی کھنکھناتی ہنسی جو میں نے فون پر سنی تھی۔

"میرا مطلب ہے، یہ علی گڑھ سے نئی نئی آئی ہیں"۔

"بہت پیاری شکل پائی ہے ہے نا؟" وہ ریاض ہی سے مخاطب تھیں۔

"جی ــ جی ــ" ریاض گھبرا گیا اور میں کٹ کے رہ گئی۔

پارٹی کے بعد سب ادھر ادھر بکھر گئے، ریاض نے دکی کو جا پکڑا۔

"قسم اللہ کی یار تم بڑے گدھے ہو!"

"ہوا کیا؟" وہ سٹ پٹا گیا۔

"یعنی یہی کہ اتنے زمانے سے کبھی تو ذکر کیا ہوتا" میں نے ریاض کی طرف دیکھا تو اس نے پھر وہی انداز اختیار کیا "یہی کہ دیکھو نا کتنے چوہے ہو گئے ہیں ــ بلّی تو ......"

گرما کی خوشگوار سی ہوا بھی میرے کانٹے چبھو گئی۔

میں کانوں کے گرد ساڑی لپیٹے ہوئے جلدی جلدی جانے

لگی تو شرارت بھری آواز سنائی دی۔ "یس پلیز !"
میں نے مڑ کے دیکھا تو وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔
میں سیڑھیاں چڑھ رہی تھی تو پھر آواز آئی۔
"میاؤں میاؤں !!"

زمانہ بیت رہا ہے۔ بیتا جا رہا ہے، راہیں کتنی جلد طے ہو رہی ہیں، کیا منزل میرے قدم چومے گی ؟ میں بیٹھی ہوں۔ اس میز کے قریب، جہاں فون رکھا ہے، اور اپنی بے نور سی آنکھوں سے ماضی کے جھروکوں میں جھانک رہی ہوں، میرے ہاتھوں میں کوئی البم نہیں، کوئی تصویر نہیں۔ پھر یہ دھندلے دھندلے سائے جیسے کیا تیر رہے ہیں؟ مجھے اپنی ایک عادت یاد آ رہی ہے، میں ہمیشہ اپنے البموں کے پہلے صفحے پر کوئی شعر لکھ دیا کرتی تھی، ایک بار ایک البم پر میں نے یوں ہی ایک شعر لکھ دیا تھا ؂

کھو کے مت رو مجھے اے شمعِ شبستانِ حیات
زندگی لوٹ کے آئے گی نہ پروانے کی

لیکن اب جو یہ تصویریں میری نگاہوں کے سامنے ناچ رہی ہیں تو میں سوچ رہی ہوں اس البم پر میں نے ایسا کون سا شعر، ایسا کون سا منحوس شعر لکھ دیا تھا جو میرا مقدر بن کر رہ گیا۔ پروانے کی زندگی تو کبھی بھی لوٹ کر نہ آئے گی پھر یہ آنسو ! یہ شمع کے جلتے جلتے آنسو، اور یہ لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلتی تصویریں ـــــ ؟؟

چڑیا دوڑ جاگری اور اس کے ساتھ ہی ہم نے اپنا کھیل ختم کر دیا۔

وکی جلا اٹھا۔

" یہ آپی تی بچی سدا ہار نے پر آتی ہے تو بے ایمانی کرتی ہے"۔

ڈیڈی ہنس کر بولے۔

" اچھا تو یہ سمجھ لو تم جیت گئے"۔

وہ رونی آواز سے بولا " یوں مزہ نہیں آتا"۔

" ارے یوں لڑکیوں کی طرح بسورو تو نہیں۔ پھر کسی دن نبٹ لیں گے"۔

ریاض اس کی بیٹھ تھپ تھپاکر بولا " ویسے اصل بات تو یہ ہے کہ لڑکیوں کی ذات کچھ بے ایمان ہی ہوا کرتی ہے"۔

میں نے جل کر اس کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ کبھی میری طرف نہ دیکھتا تھا

ڈیڈی اٹھ کر اپنے کسی دوست سے ملنے چل دیے دہیں لوگ رہ گئے۔ ڈیڈی کے جاتے ہی سارے بچے آ گئے، ریاض نے ایسی ایسی گپیں ہانکیں کہ میں بہت مشکلوں سے ہنسی ضبط کر پائی، سب بچے حیرت سے منہ کھولے ہنستے رہے، اکدم میں نے محسوس کیا کہ باتوں ہی باتوں میں بچوں کی آڑ لے کر وہ ایسی باتیں کہہ رہا ہے جس کا مخاطب بس مجھ ہی سے ہو سکتا ہے، میں گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرے کان سن سن کر رہے تھے۔ پیچھے سے مجھے آواز آئی۔

"پھول! تمہیں معلوم ہے ایک دیش ہے جہاں کے پھول بھی باتیں کرتے ہیں۔ ہماری تمہاری طرح چلتے پھرتے ہیں"

میں نے حسب عادت اسے پلٹ کر دیکھا تو وہ ہمیشہ کی طرح ڈالی پر لگے گلاب سے مخاطب ہو گیا۔

"تمہیں حاصل کر لیا تو سمجھو دنیا حاصل کر لی دوست" ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور گلاب دور ہو گیا۔

گلاب کے پھول کے ساتھ سدا کانٹے ہوتے ہیں، یہ بات مجھے اس وقت معلوم نہ تھی۔ جب تو میں نے یہ سوچا تھا کہ اگر ریاض کو پھول پسند ہے تو وہ ہاتھ بڑھا کر توڑ کیوں نہیں لیتا۔

لیکن گلاب کے پھول میں یہ حسن نہ ہوتا اگر اس کے ساتھ کانٹے نہ ہوتے۔ ہنسی اسی لئے تو پیاری ہوتی ہے کہ آنسوؤں کی پالکی میں سوار ہو کے آتی ہے، بغیر غم کے خوشی ہی کیا؟

لیکن یہ کیسی ہنسی تھی، کیسی خوشی تھی کہ آنسوؤں کے دریا میں بہتی چلی گئی۔ اور پھر ہنسی چلی گئی، آنسو رہ گئے، آنسو ہی آنسو!!

گھبرا کے میں نے پٹی کھول دی "بھئی ہم سے نہیں ڈھونڈا جاتا"

"میں کہتا ہوں نا" وکی کا پارہ چڑھ گیا۔ "اب سے اس

گدھی کو کبھی ساتھ نہیں کھیلنے دیں گے۔ بے ایمان کہیں کی ـــــ"

"اے ـــ میں تم سے بڑی ہوں جی !" میں چلائی

"بہت دیکھے ایسے بڑے !" وہ چڑ کر بولا "عجیب لڑکی ہے، پھر آنکھ مچولی کھیلنے آئی کیوں تھی ؟"

ریاض بہت آہستگی سے کہہ گیا۔ صرف میں ہی سن سکی۔

"چور ڈھونڈنا بہت مشکل کام ہے ؛ اور پھر دل کا چور !"

میں نے اسے دیکھا تو وہ ہمیشہ کی طرح، جھٹ سے آنکھیں اٹھا کر چاند سے باتیں کرنے لگا ؛

"تمہارے دم سے میں نے اپنے دل میں چاند نیاں بھر لی ہیں، کہیں بدلی میں نہ چھپ جانا۔

کھیل بگڑ گیا تھا، دکی غصہ ہو کر چلا گیا تھا۔ دوسرے چھوٹے بچے وہیں "چڑی چھپاکا" کھیلنے میں جٹ گئے۔ میں رانی کا ہاتھ پکڑ کر جانے لگی تو سنائی دیا۔

"قسم اللہ کی بلی ! گھبرا کر دیکھا تو ریاض بیٹی بلی کو گود میں لئے اس کے کان سے منہ لگائے ہنس رہا تھا۔

رانی کچھ جھلا کے بولی۔

"اللہ جانے ریاض بھائی کو بلیوں سے اتنی رغبت کیوں ہے ؟"

میں بڑی طرح جھینپ کر رہ گئی۔

یادوں کا دامن تار تار ہو رہا ہے، کیسی کیسی دلخراش یادیں !!

دریا تو دریا ہیں سمندر بھی میری آنکھوں میں سما جائیں تو رد تے نہ تھکوں، ریاض اور میں کتنی تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آرہے ہیں۔

یہ گرما کی، موتیا کے پھولوں سے مہکتی شامیں، یہ جاڑوں کی سرد سرد سی شامیں، یہ برسات کی رم جھم رم جھم شامیں، رم جھم برسنے والی شامیں سدا حسین ہوتی ہیں آج کی شام بھی تو رم جھم برسات لے کے آئی ہے اپنے دامن میں! یہ برسات ؛ یہ آنسوؤں کی جھڑیاں!

تین بار فون کی گھنٹی بجی اور چوتھی بار میں نے رسیور منہ سے لگالیا۔

"یس پلیز!"

"بس بس، میں آگے ہی مر چکا ہوں" ہنسی کی آواز آئی یہ ریاض ہی تھا نا؛

شام کو رجی کی سالگرہ کا جشن تھا۔ کتنے ہنگامے، کتنے رنگا رنگ پروگرام کتنی دھوم دھام، وہ بھی تو آیا تھا۔ کیسی جگمگاتی شام تھی۔ اور اس دن جیسے سارے فاصلے طے ہو گئے تھے۔

جیجی نے لان میں بیٹھ کر بلبل ترنگ پر گانا سنایا تھا دکی نے گدھے، گھوڑے، مرغے اور کتے کی نقلیں اتاریں ننھی روبی نے انگلش ڈانس کا پوز بتایا۔

I LOVE YOU ____ جو انہیں کانونٹ میں سکھلایا۔
گیا تھا۔

بیٹھے بیٹھے ریاض نے آسمان کی طرف دیکھا اور بولا۔
" کتنے ستارے ہیں آسمان پر، لیکن ان میں ایک تارہ سب سے زیادہ روشن ہے۔ یہ پیچ والا۔"
" ایسا کیوں ہے بھیا، سبھی تارے ایک سے کیوں نہیں ہیں ؟" روبی نے پوچھا۔
" بہت گہرا جواب دیا ریاض نے
" دل میں کتنی ساری تمنائیں ہوتی ہیں۔ کوئی چھوٹی کوئی بڑی۔ لیکن ایک تمنا ان سب تمناؤں سے بڑی ہوتی ہے۔ چاہے وہ کوئی سی ہو۔"
اس نے باری باری سب کے چہروں کا جائزہ لیا، کوئی کچھ نہ سمجھا " جیسے یہ روشن ستارہ ہے نا ؟" کتنی آہستگی سے اس نے کہا تھا۔ " بھلا کوئی بوجھے تو۔ میرے دل کی سب سے روشن تمنا کون سی ہے ؟"
لیکن اس نے مجھے نہیں دیکھا، میری آڑ لے کر پھولوں کلیوں اور ستاروں سے بات کرنے کی یہ ادا اس نے کہاں سے سیکھ لی !
رات بستر پر لیٹ کر میں نے کھڑکی میں سے جھانکا۔ میری آنکھوں کے بالکل اوپر ہی وہ ستارہ چمک رہا تھا۔
میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی
" میرے خدایا ! یہ ستارہ سدا یوں ہی جگمگاتا رہے۔

اب مجھے یہ بھی بتانا ہوگا یہ ستارہ کیسے جگ مگاتا تھا ــــــ؟؟

بادل چھاتے ہیں، گرجتے ہیں اور برس جاتے ہیں، نہ برسیں تو کیا ہوتا ہے، آسمان بوجھل ہو جاتا ہے میرے دل کا آسمان بھی اس لمحہ بوجھل ہوا جارہا ہے۔ بادل چھا چکے ہیں۔ لیکن برسنے کے کوئی آثار نہیں ہیں۔

یہ یکایک برسات رک کیوں گئی۔ برس جاؤ اے بادلو، ورنہ یہ دل پھٹ کر رہ جائے گا، اب میں اپنے البم کی سب سے غمناک تصویر ڈھونڈ رہی ہوں، میں چاہتی ہوں اس تصویر کو دیکھ کر میں رو پڑوں، یہ میرے دل پر بھتری کی سِل جیسی کس نے رکھ دی، یہ بادل برستے کیوں نہیں ؟ برسات کے موسم کا حسن تو اسی میں ہے کہ رم جھم بارش ہوتی رہے۔

یہ تصویر میرے سامنے ہے اور اب میرا دل پگھلتا سا محسوس ہو رہا ہے، میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں، میرا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا ہے کہ مجھے اس کی دھڑکن تک سنائی دے رہی ہے۔

میں نے اپنے کانپتے ہونٹ اس تصویر پر رکھ دیئے ہیں لو کہیں نہیں ہے، اور ہر جگہ ہے، اب میری آنکھوں سے دھند چھٹ رہی ہے اور میں یہ سب کچھ دیکھ سکتی ہوں۔

امی میرے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں، ریاض آیا اور امی کے سامنے بیٹھ کر سعادت مند بچے کی طرح کہنے لگا۔

"چچی جان ؛ میری سمجھ میں نہیں آتا....."
امّی نے مسکرا کر اس کی بات کاٹ دی " تمہیں اتنا سنجیدہ تو آج ہی دیکھ رہی ہوں "
وہ کھلے دل سے ہنس پڑا ــــ " میرا جملہ پورا ہوتے ہی آپ خود دیکھ لیتیں کہ میں کس حد تک سنجیدہ تھا "
" ہاں تو کہنا کیا تھا ــــ ؟ " امّی نے ہنس کر پوچھا۔
وہ پوری سنجیدگی سے بولا " یہی کہ آپ کتنی اچھی ہیں !"
امّی ہنس پڑیں " بہت شریر ہے ــ نا ــ !"
اتنے میں بچوں کی ایک ٹولی آئی اور محفل کا رنگ بدل گیا، امّی اٹھ کر چلی گئیں، وہ ٹیبل پر جھکا اور ریسیور ہاتھ میں لے کر بولا
" پھر تو وہ میٹھی آواز سنانا ــــ " یس پلیز !"

میں نے گھبرا کر دیکھا، لیکن وہ بچوں میں رل مل گیا، دروازے میں وکی اپنے لمبے لمبے ہاتھوں میں سے کے کان پکڑے گھسیٹتا داخل ہوا۔ میں وہیں سے چیخی ــــ
" یہ کیا بدتمیزی ہے وکی ــــ ؟ "
" بسکٹ کھالئے اپنے حصّے کے، وہ احسان گیا چولہے میں، الٹی پھٹکار پڑ رہی ہے ہونہہ !" وہ غصّہ ہو گیا۔
"کیا بات بات پر غصّہ ہوتے ہو دوست ؟ " ریاض نے اسے سنا لیا " مگر کہتا ہے بہت اچھا "
وکی سن گیا۔

"ہاں اور کیا ــــ بے چاری آپا کو دو ہی چیزوں سے تو پیار ہے بس دنیا میں، طوطا یا پھر کتا، پھر ذرا نچی آواز سے بولا ۔ "مگر اللہ جانے بنّی کتے کی بنہ ہی کیسے جاتی ہے؟"

میں جل بُھن کر رہ گئی۔

"ہائیں!" ریاض حیرت سے چیخا "طوطا"

"ہاں اور کیا؟" وکی بیزاری سے بولا "سارے زمانے کی باتیں پوچھ لیجئے ان کے طوطے سے!"

"اچھا تو یہ سلسلے ہیں!" وہ مسکرا کر رہ گیا۔

میں نے اس کے اس طرح پوچھنے پر اس کی طرف دیکھا تو وہ اتنے میں روبی کی ٹھوڑی پکڑ کر ہنستے ہوئے کہنے لگا تھا۔

"روبی گڑیا! اگر تمہاری آنکھیں جو بھوری ہوتیں نا، تو بس ہم تم ہی سے شادی کر لیتے!"

روبی تن تنا کر بول اٹھی۔

"تو پھر آپا ہی سے کر لیجئے نا ــــ اُن کے تو بال بھی بھورے ہیں۔"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس وقت میرے ہاتھوں میں کتاب تھی جس کی آڑ میں میں نے خود کو محفوظ کر لیا تھا۔

باغ میں جامن کی ڈالی سے میں نے اپنے طوطے کا پنجرہ لٹکا رکھا تھا۔ آتے جاتے میں اس سے بہت دلار سے پوچھتی "بلو مٹھو پیارے! کیا حال ہیں؟"

"وہ تائیں سے جواب دیتا۔ "دعا ہے حضور کی!"

پھر میں پوچھتی۔

"کھانا دانا ملا؟"

وہ بہت اداسی سے کہتا ۔ "غریبوں کو کون پوچھتا ہے ۔!"

اس دن جو میں نے پنجرے کو جھکولا دے کر پوچھا

"ہلو مٹھو پیارے کیا حال ہیں؟" تو وہ بہت اداسے گردن جھکا کر بولا۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں!"

چلتے چلتے میں تیزی سے رک گئی۔ وہ یکساں رٹ لگائے ہوئے تھا۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں!"

"ہلو مٹھو پیارے کیا حال ہیں؟" اب کے میں نے اس کے قریب جاکر پوچھا۔

وہ پھر دہرا گیا

"میں تم سے محبت کرتا ہوں!"

میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"کھانا دانا ملا۔؟"

وہ پھر دہرا گیا ۔ "میں تم سے محبت کرتا ہوں"

میں نے ادھر ادھر دیکھا، اظہارِ محبت کا اس سے عجیب و غریب طریقہ کسی نے اپنایا ہوگا!

پنجرہ جھکولے کھا رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس

کا چھوٹا سا دروازہ کھول دیا۔ طوطے نے اپنے پر پھڑ پھڑائے اور پھر سے اڑ گیا۔

میں نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی، یہ تو میں ہی تھی، اگر یہ الو کا پیغام کسی اور کے پاس پہنچ جاتا تو !؟"

" میں تم سے محبت کرتا ہوں !"

طوطا اڑا چلا جا رہا تھا، میں نے بہت بے بسی سے اس اڑتے پنچھی سے کہا تھا

" اگر میں ایک ہندوستانی لڑکی نہ ہوتی میرے پنچھی؛ تو میں بھی اپنے من مندر کے دیوتا کو اپنے دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا سلام بھیجتی ــــ

" میں تم سے محبت کرتی ہوں "

اور پھر ایک دن وہ بچوں کے گھیرے میں بیٹھا انہیں کہانی سنا رہا تھا،

" بس اس شہزادی کے پاس اپنا پیغام پہنچانے کے لئے شہزادے نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ شہزادی کے مٹھو کو سکھا دیا کہ ہر بات کے جواب میں بس یہ کہا کرے۔

" میں تم سے محبت کرتا ہوں "

اور اس دن پہلی بار ــــ بالکل پہلی بار میں ریاض سے مخاطب ہوئی۔

" شہزادے کا پیغام شہزادی تک پہنچ تو گیا، لیکن شہزادی نے لوک لاج کے ڈر سے اپنے پالتو پنچھی کو اڑا دیا، آخر کو طوطے کی ذات بے وفا مشہور ہے، اگر اس کی محبت کا بھانڈا پھوڑ

دیتا تو ؟"

ریاض نے پلکیں جھپکا جھپکا کر دو تین بار تو مجھے حیرت سے دیکھا پھر وہ سنبھل گیا، مسکرا کر بولا۔

"مگر پیغام پہنچا تو سہی!"

میں نے کھوئی کھوئی نظروں سے اسے دیکھا، اور میری نظریں آپ ہی آپ جھک گئیں۔

اقرار محبت کی کیسی عجیب رسم تھی خدایا، لب کھلے نہ آنکھیں ہی ملیں اور ہزاروں میلوں کے فاصلے طے ہو گئے یہ فاصلے!

اُن فاصلوں کا خیال آتا ہے، ان دوریوں کا خیال آتا ہے جنہیں آنکھوں کی ایک ہلکی سی جنبش نے طے کر دیا تھا، اب مجھے، آنسوؤں کے ساتھ ان لمحوں کی یاد آتی ہے جنہوں نے کبھی میرا آنچل تھام کر مجھ سے پیار کرنے کی التجا کی تھی، ان بیتے لمحوں کا دامن تھام کر آج میں اپنی آنکھوں کے جلتے بجھتے دیپوں کی روشنی لٹا بیٹھی ہوں۔

کیسی روشنی ہے یہ؟ کیسا اندھیرا ہے یہ؟ کتنے جھل مل کرتے لمحے، کتنے اداس لمحے، کتنے مسکراتے گاتے لمحے، کتنے روتے لمحے، میرے سامنے ہیں، میں ان تصویروں کو کون سے البم میں سجاؤں میرے محبوب!

آج یادوں نے میرا دل کھرچ کھرچ کر رکھ دیا ہے، ایک ایک آنسو، ایک ایک داستان کہہ رہا ہے، ایک ایک آنسو ایک ایک تصویر کو اجاگر کر رہا ہے۔ یہ تصویر کیسی ہے؟

ریاض کو اچانک سروس کال آ گیا۔ اس کے جانے میں کل بائیس دن تھے۔ وہ روز آنہ مجھے فون کرتا، میں ریسیور ہاتھ میں تھام کر، کہنیاں ٹکا کر میز پر، بہت ملائم سی آواز میں پوچھتی۔

"یس پلیز!"

"کیا کر رہی تھیں؟"

"سچ سچ بتا دوں؟"

"وہ تو بتانا ہی ہو گا!"

"تمہیں یاد کر رہی تھی!"

"اوہ سونٹ بی!!"

"ٹرن.... ٹرن۔ ٹرن ...... "

"یس پلیز!"

"کیا کر رہی تھیں؟"

"ٹھنڈے پانی میں تلوے ڈبو کر بیٹھی تھی، گرمی جو پڑ رہی ہے"

"مار ڈالا بی! قسم اللہ کی ــ سفید چمکتے پانی میں وہ گلابی گلابی نخلی تلوے، اچھا ہوا جو میں نہ ہوا، ورنہ مر جانے میں کیا کسر رہ گئی تھی؟"

وہی کھنکھناتی ہوئی ہنسی جو میرے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے ریاض کے جانے میں کتنے کم دن رہ گئے ہیں!!

ریاض کو تو جانا ہی تھا!

میں نے اس دن اپنے دل کی تمام دھڑکنوں کو قابو میں رکھ کے پوچھا تھا۔

" پریوں کی کہانی والے شہزادے ، یہ تو بتاؤ تمہارے دل کے آسمان کا سب سے روشن ستارہ کون سا ہے ؟ ؟ "

ریا من نے میرے سر کو اپنے دل کے قریب کر لیا۔

" کلیوں ، پھولوں اور ستاروں کو راز دار بنا بنا کر پیغام بھیجنے کا وقت چلا گیا۔ اب تو دھڑکتے پھڑکتے دل ہی ایک دوسرے کے راز دار ہیں "۔

میں نے تڑپ کر دیکھا، وہ بھیگے بھیگے لہجہ میں بول رہا تھا ۔ !

" پگلی ___ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں ! "

میں نے تو اس پنچھی کو لوک لاج کے ڈر سے اڑا دیا تھا۔ پھر یہ پنچھی کدھر سے آگیا ؟ کیا اسے دنیا سے ڈر نہیں لگتا ؟ ریا من کا مضبوط دل تیزی سے میرے کانوں کے پاس دھڑک رہا ہے۔

دھک ..... دھک ..... دھک ..... اتنی مضبوط اور ہم آہنگ دھڑکن ، میں کیوں ڈروں ؟ اس دل کی دھڑکن پر مجھے اعتماد ہے۔ یہ میرے ہی لئے تو دھڑکتا ہے ، بھٹکا پنچھی پھر اپنے آشیانے میں آ بیٹھا ہے اور کہہ رہا ہے ۔

" میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ میں تجھ سے ..... "

لوگ تو کہتے ہیں لہو طالب دنیا پر زندہ ہوتا ہے ، ایک

بار اڑا دو۔ پھر کبھی لوٹ کے نہیں آتا۔ پھر یہ آواز کیسی ہے ؟ یہ پنچھی لوٹ کے آیا کیسے ؟ میں نے تو اسے اڑا دیا تھا نا ؟

یادوں کی اس دھندلی سی شام میں بس دو ہی سائے ہیں، میں اور ریاض ..... ریاض اور میں ..... میں، میرا ریاض ..... !

میں کالی ساڑی پہنے بیڈمنٹن کورٹ کی طرف چلی جا رہی ہوں، ریاض آ کر میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیتا ہے

" بولو بلقیس! چاند کدھر سے نکلتا ہے ؟"

میں دونوں ہاتھ چھڑا کر اپنا منہ چھپا لیتی ہوں، انگلیوں کی کھڑکیوں میں سے شرما شرما کر ریاض کو دیکھ رہی ہوں۔ جو مجھ سے پوچھ رہا ہے ۔

" چاند کدھر سے نکلتا ہے .... کدھر سے ...."

میں مسکرا رہی ہوں۔

شرما رہی ہوں۔

میری تیرہ و تار زندگی سے غم کے اندھیرے مٹ گئے ہیں، چاند کدھر سے نکلتا ہے ؟ کیا مجھے یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ میرا چاند میرے سامنے جگمگا رہا ہے ۔؟

کسی نے کہا ہے ۔

" زندگی مسرت ہی مسرت ہے !"

میں آنسوؤں کی جلتی مشعل لئے اس شخص کا پتہ ڈھونڈ

رہی ہوں، جس کے ہونٹوں پر سدا بہار مسکراہٹ جس کے پہلو میں غم کی چبھن نہ ہو۔

لیکن کیا میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو سکوں گی۔ وہ چاندنی کدھر چھپ گئی ہے؟ اندھیروں کا کتنا بھیانک کتنا گہرا سایہ ہے میرے خدا! کیا میں نے بھی کبھی چاند کا منہ دیکھا تھا؟

میرے اشکوں کے چراغ میرے دامن میں روشنی پھیلا رہے ہیں، لیکن یہ کیسا اندھیرا ہے؟ کہ چراغوں سے گھٹنے کے بجائے اور بڑھتا ہی جاتا ہے، اب ان اندھیروں میں، میں کون سی تصویر دیکھوں؟

سب سائے دھندلے اور مبہم ہیں، جیسے کسی نے تیز دھوپ میں تصویریں کھینچی ہوں، مٹی مٹی اور غیر واضح بس ایک تصویر باقی ہے، جس پر میری نظریں پتھر بن کر جم گئی ہیں ـــ یہ میری ہی تو تصویر ہے، میرے دلہناپے کی۔

لیکن اس تصویر کو دیکھنے سے پہلے مجھے وہ تصویریں بھی تو دیکھنی ہوں گی جو دھندلا ضرور گئی ہیں، لیکن یادوں کے اُفق پر اب بھی جھلملاتی ضرور ہیں!

ریاض کو اسٹیشن پہنچاکر اور اسے "سی آف" کر کے جب ہم لوٹ رہے تھے تو نعیم بھیّا نے مجھے بھرپور دلاسا دیا تھا۔

"بری بات ہے بلقیس! روتے نہیں یوں۔ اور پھر ریاض ایسے کون کالے کوسوں گیا ہے؟"

انہوں نے اپنا رومال دیا۔

" لو یہ آنسو پونچھ ڈالو، بری بات ہے، لوگ تو سمندر پار چلے جاتے ہیں یہ کیا بزدلی ہے؟"

میں نے آنچل سے آنکھیں صاف کر کے انہیں دیکھا، گھبرا کر دیکھا، سہم کر دیکھا۔

میں آگے ہی کہتی تھی یہ ہچکی بھرا ہوتا ہے۔ ہچکی کی تان کتنی اونچی تھی؟ کیا چاروں کھونٹ اس کی آواز پہنچ گئی ہے کیا — کیا میری محبت کا راز آشکارا ہو گیا ہے؟

کار کو دھیمی رفتار پر چھوڑ کر نعیم بھیا نے میری توجہ کو بٹانا چاہا۔

" دیکھو — یہ کنگ کوٹھی ہے — یہ بشیر باغ ہے۔ — اور ہاں دیکھو! تم روؤ نہیں — دیکھو تو تمہارا دل بہلانے کے لئے میں کتنا بڑا چکر کاٹ کے کار گھر لے جا رہا ہوں "

میں نے کانپ کر انہیں دیکھا —

ہمدردی — مجھے اس لفظ سے چڑ ہے، میں نہیں چاہتی کوئی میرے غم پر اپنی آنکھیں نم کرے۔

ستارے ڈوبتے ہیں تو اندھیرا ہو جاتا ہے، یہ بہت پرانی بات ہے ریاض! لیکن ستاروں کے ابھرنے سے جو اجالا ہوتا ہے وہ کہاں ہے؟

دیکھو نا میں نے کتنے سارے ستارے رولے ہیں، مگر یہ اندھیرا؟ مجھے تم سے تو کوئی شکایت نہیں ریاض! کہ تم نے مجھے دکھ دیا، یہ تو میری لازوال دولت ہے جسے میں خوشی

سے سبھالے ہوئے ہوں۔ جس پر نازاں ہوں۔ لیکن میرے رحمدل ساتھی! کبھی یہ بھی سوچا کہ میرا نازک سا دل اتنے سارے غموں کا بوجھ کیسے سبھالے گا؟

نعیم بھیا! اس دن میرے آنسو پونچھنے آئے تھے۔ میرا دل بہلانے کو شہر میں گھماتے ہوئے لائے۔ اور اب مجھے اس بات کا ذکر بھی مزدوری معلوم ہوتا ہے کہ وہ شہر کے کامیاب بیرسٹر تھے اور تم ڈھائی تین سو روپے پانے والے ایک معمولی سے ڈاکٹر۔۔۔۔

اور پھر یہ ہوا کہ زندگی بھر کے لئے نعیم بھائی نے میرے آنسو پونچھنے کا ٹھیکہ لے لیا۔ میرے دل بہلانے کا ذریعہ بن گئے۔ جم چماتی کار اور اونچی سی سفید بلڈنگ ۔۔۔ کیا میرے زخموں کا مرہم ہو سکتی ہے ریاض؟!

کیا محبت کا مارا دل کار میں گھوم کر اور نرم صوفوں پر بیٹھ کر مطمئن ہو سکتا ہے؟

اب مجھے یاد آتا ہے ریاض! کہ اجالا ہوتے بہت دیر لگتی ہے۔ سورج ہو یا چاند گھنٹوں میں اپنی مسافت طے کرتا ہے تب کہیں جا کر اجالا پھیلتا ہے۔

لیکن اندھیرا؟ وہ تو پل بھر میں گھس آتا ہے۔ ذرا سورج کے چہرے پر بدلی چھائی اور اندھیرے چھائے۔ میرے چاند! تم نے بھی تو اپنا منہ بدلی میں چھپا لیا ہے۔ اور اب اندھیروں کا ذکر ہی کیا ہے کہ زندگی ہی آنسو بن کر رہ گئی ہے۔ کبھی کبھی مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں، کائنات کی آنکھ سے ٹپکا ہوا ایک درد بھرا آنسو ہوں جسے

کسی دامن میں پناہ نہ ملی ۔ ۴۵

یہ تصویر دیکھ رہے ہو تم ؟؟

میں دلہن بنی بیٹھی تھی۔ پھولوں، خوشبوؤں، زیوروں سے لدی ہوئی، میرا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ کیا میرے جسم کو ان آرائشوں کی ضرورت تھی ریاض؟

پھر یہ کیسا انصاف تھا، ہر طرف کھنکتے ہوئے قہقہے تھے اور بے فکر ہنسی، لیکن تم کہاں تھے اور میں کہاں تھی۔ کیسا کھیل ہے یہ میرے معصوم ساتھی۔ دلوں کی دنیا اجڑتے کیا دیر لگتی ہے۔ ابھی روشنی تھی، ابھی اندھیرا ہے۔ ابھی، مسکراہٹ تھی ابھی آنسو ہیں۔ اور بالوں میں برف کی، راکھ کے تودے:

میں فہیم کی دولہن بن کر آ گئی دن گزرتے چلے۔ گزرگزرتے چلے گئے....

اور تم ــــــ؟ ہر موڑ پر تمہاری یادوں کے، تمہاری اسٹ محبتوں کے نقش گہرے اور گہرے ہوتے چلے گئے۔ لوگ تو بھول بھال بھی گئے کہ تم نے کبھی خودکشی کی چار دن سوگ رہا اور پھر وہی زندگی اور زندگی کے ہنگامے مرنے والے کے ساتھ کون مرجاتا ہے ریاض! لیکن میں آج بھی ہر روشن ستارے کو دیکھ کر پوچھتی ہوں، جس دل میں تو بستا تھا وہ دل کہا کھو گیا؟

ریاض! تمہارے دل کی دھڑکن بہت مضبوط تھی بہت تیز، مجھے اس پر کل بھی اعتماد تھا، اور آج بھی ہے لیکن یہ جو کچھ ہوا، اس میں میرا تمہارا کوئی قصور ہے؟ آج بھی میرے سینے پر پتھر جیسے رکھے ہیں، لیکن

یہ بوجھ ٹلے تو کیسے ؟ میری حالت دیکھو تو سہی، آنکھیں بے نور سی ہو چکی ہیں، بالکل کم دکھائی دینے لگا ہے۔ ہاتھ تھر تھرانے لگے ہیں۔ بالوں پر برف پڑ چکی ہے، اور یہ کچھ مجھے اب آنسوؤں کے ساتھ یاد آتا ہے کہ اس دل کی ہر ہر ادا پر تم کیسے فدا تھے ؟ پھر کیا یہی تمہاری محبت تھی ؟؟

میں نے البم کا ایک ایک ورق الٹ دیا ہے، اب کیا رہ گیا ہے۔؟ کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں، اب بھی کبھی کسی کا فون آتا ہے اور مجھے ریسیو کرنا پڑتا ہے تو میرے ذہن میں پچھلی تصویریں ابھرنے لگتی ہیں۔

گئے یہ سب کچھ تو ہو گیا ریاض، لیکن میں آج بھی سوچتی ہوں اگر کوئی چپکے سے آکر میرے دونوں ہاتھ پکڑے اور پوچھے۔

"بولو چاند کدھر سے نکلتا ہے ؟"

تو میں یوں چھپانے کو اپنا منہ چھپا تو لوں، لیکن میں کیا جواب دوں گی کہ چاند کدھر سے نکلتا ہے ؟

میرے پورن ماشی کے چاند؛ تم تو افق کی پہنائیوں میں ڈوب چکے ہو اب میں کیا جواب دوں گی ؟ میرے بالوں پر برف پڑ چکی ہے، ہاتھ کانپنے لگے ہیں بے نور آنکھوں نے بجھے ہوئے چراغوں کا روپ دھار لیا ہے۔ لیکن اب تک بھی کوئی پوچھنے نہیں آیا، نہ سہی، لیکن اتنا بتا دو میرے اپنے ریاض ! اگر کوئی آ ہی گیا تو ـــــ

تو میں کیا جواب دوں گی ـــــ ؟

کیا جواب دوں گی ـــــ ؟؟

چاندستارہ

شاہینہ مسلسل ایک ہی ریکارڈ کو بار بار بجائے جا رہی تھی۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

ہواؤں میں نمی سی رچی ہوئی تھی۔ ادھ کھلے دریچوں سے موتیا کی کچھ بند کچھ کھلی کلیوں سے پھوٹتی خوشبو جیسے جھجکتے سہمتے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ ہوا کا ایک شوخ جھونکا فوزیہ کے چہرے سے ٹکرایا تو اچانک اسے اپنی آنکھوں میں لرزتے آنسوؤں کے گر پڑنے کا خدشہ محسوس ہوا۔ اسی دم شاہینہ نے مڑ کر پوچھا۔

"اے ری بجو! یہ دیدۂ تر کیا ہوتا ہے؟"

فوزیہ نے گھبرا کر شاہینہ کی طرف دیکھا، پھر اسی لمحہ اس نے ساڑی کے آنچل سے اپنی آنکھیں پونچھ لیں اور قدرے مسکرا کر بولی۔

"تو تو پگلی ہے شنو؛ دیدۂ تر تو کچھ بھی معنی نہیں رکھتا۔ یہ شاعر بھی خوب ہوتے ہیں۔ جو جی میں آئے کہہ دیتے ہیں"

"تو فوزی؛ یہ تم کہہ رہی ہو کہ دیدۂ تر کچھ معنی نہیں،

رکھتا، پر ابھی یہ تم نے اپنی ریشمین ساڑی کے آنچل میں
شبنم کے سے قطروں کو جو سمیٹ لیا ہے تو یہ کیا کچھ تھا؟
—— پھر کیوں دیدۂ تر کچھ معنی نہیں رکھتا؟
پھر کہو —— کہو نا —— !"
فوزی نے گھبرا کر شاہینہ کو دیکھا
"تو نے کچھ کہا شاہینہ ؟"
وہ حیران اور پریشان سی ہو کر بولی۔
" نہیں تو باجی! میں تو خود آپ کی باتیں سنتی تھی، تو
سچ دیدۂ تر کچھ معنی نہیں رکھتا؟ آں باجی —— ؟؟"
فوزیہ کے کانوں میں شاہینہ کی آواز کہاں پہنچ رہی تھی
ریکارڈ کی آواز سارے میں گونج رہی تھی۔
پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
پھر مجھے..........
فوزی نے بے بسی سے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس
لیں ——

فوزی نے عاجز آ کر اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس
لیں ——
" شفیق بھائی! آپ تو سچ مچ ناک میں دم کئے رہتے
ہیں —— "
" میں نے کیا کیا ہے حضور؟ کچھ مجھ سے پوچھ رہے

تے ہم نے کبھی پری نہیں دیکھی۔ پری دیکھنا چاہتے ہیں میں نے دکھادی۔ اب اس بات سے آپ کی ناک میں دم آنے کا کیا تعلق ہے، یہ میری سمجھ میں نہیں آتا "۔
پھر وہ شرارت سے جھک کر مسکرایا۔
" اور یہ تو آپ نے سنا ہی نہیں، میں نے انہیں یہ بھی تو بتایا ہے کہ کھلی چھت پر جو شہزادہ سو یا تھا، جس نے، شہزادی کا دل لوٹ لیا تھا وہ یہی خاکسار تھا "۔
" قسم اللہ کی، آپ بالکل ویسے ہیں، میں آپ سے کبھی نہ بولوں گی۔" اور فوزی اپنی ساڑی کا آنچل سنبھالتی، بھاگ گئی۔
شفیق اسے جاتے دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ یوں کہ اس کا وجود ایک نقطہ میں تبدیل ہوگیا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کی طرف دیکھا۔
" چاند میں اور فوزی میں کچھ نہ کچھ رشتہ ضرور ہے " اس نے مسکرا کر سوچا
کھانے کی میز پر فوزی بالکل بھری بیٹھی تھی، شفیق پلیٹ سے چمچہ بجاتا رہا۔ جب ابو نے بیل کی تو شفیق بھی جت گیا، ابو نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا پھر کھنکھارتے ہوئے بولے۔
" فوزیہ بیٹی! تم کچھ سست سی دکھائی دیتی ہو؟ "
" جی ہاں! ہوم ورک پورا نہیں کیا تھا اس لئے ٹیچر نے بنچ پر کھڑا کر دیا تھا "۔
شفیق نے حد سعادت مندی سے بولا

ابو کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹتے چھوٹتے بچا.
"ہائیں، تم اتنی بے پرواہ کب سے گئیں بیٹی؟"
"فوزیہ نے کچھ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ شفیق بھرا بول پڑا۔
"اور ماموں جان، مجھ سے خواہ مخواہ الجھتی ہیں کہ انسان چاند پر پہنچنے والا ہے جبکہ میرا کہنا یہ تھا کہ چاند خود زمین پر موجود ہے"
ابو نے ہاتھ روک لیا
"ہائیں، چاند زمین پر کیسے موجود ہے، میں نے تو کسی اخبار میں ایسی خبر نہیں پڑھی"
ٹیلی فون کی گھنٹی نے بھرم رکھ لیا، شفیق اٹھ کر فون ریسیو کرنے دوڑا اور فوزی کو ہنسی روکنی دشوار ہو گئی۔
پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
شمالی دریچوں سے ہوائیں آ آ کر فوزی کو چھیڑ رہی تھیں۔ سونے کی طرح جھل مل کرتا اس کا رنگ سنہری ساڑی میں اور بھی لو دے اٹھتا تھا۔
آنکھوں میں شفاف شبنم کی طرح ٹھہرے ہوئے آنسوؤں کے قطرے!! ہوا جیسے پاسِ حسن سے جھجک کر سہم گئی، فاختی رنگ کے پردے ہلتے ہلتے ٹھہر گئے، بس ہوا اور فضا میں موتیا کی مہک رچی رہ گئی، موتیا، جس پر فوزی کی جان جاتی تھی۔
"میں مروں گی تو اپنی قبر پر موتیا کا پودا لگوانے کی وصیت

کرکے مروں گی۔ ایک دن وہ بڑے موڈ میں آکر اپنی پسند کا اعلان کر رہی تھی۔

"اس حساب سے تو فوزیہ باجی کی شادی موسم گرما میں کرنی چاہیئے!"

"کیوں بھلا؟"

رضیہ کو شادی اور موت کا تعلق کچھ سمجھ میں نہ آرہا تھا۔

"ارے بھئی گرمیوں میں موتیا کے پھول اپنی بہار پر ہوتے ہیں نا؟ ان کے دولہا میاں جبھی تو موتیا کا سہرا باندھ کر آسکیں گے۔ ورنہ دوسرے موسم میں تو سڑے بُسے پھولوں پہ بات جائے گی۔"

فوزی کا منہ تب گیا "آپ عجیب آدمی ہیں۔ میں کیا کہہ رہی تھی اور آپ کیا ذکر لے بیٹھے!"

شفیق ہنسا

"ہاں یہ لڑکیاں اسی طرح بات گھما پھرا کر کہا کرتی ہیں۔ قبر سے آپ کا مطلب سچ مچ کی موت تھوڑا ہی تھا، وہ تو ہم جانتے ہیں۔"

فوزیہ بھناگئی "آپ کا جواب نہیں حضور ـــــ جو جی میں آئے ہانکے جاتے ہیں۔"

اس کے سیم گوں چہرے کا رنگ دم بدم بدل رہا تھا۔ اور آنکھیں مارے غصے کے کبھی تو خاکستری نظر آنے لگتیں اور کبھی بھوری۔

پھروہ اپنے شرارت بھرے چہرے کو اس کے چہرے
ے بہت قریب لاکر بولا ــــ" مگر آپ یقین رکھئے، کسی کو ہم
میں شادی ہوئی میں آپ کے گھر دولہا بن کر آؤں گا تو موتیا
ہی کا سہرا باندھ کر آؤں گا"

فوزیہ نے چہرہ اٹھا کر اسے غصہ سے گھورا،
"ہونہہ ، دولہا بن کر آئیں گے یہ ؟"
اس کی آنکھوں میں حقارت ہی حقارت بھری ہوئی تھی
شفیق اسے بھی محبت کا ایک انداز سمجھا۔

پھر اچانک یوں محسوس ہوا جیسے گھر میں برات اتر گئی
ہو ، ہر طرف چہل پہل اور دھوم دھڑکا ؛ پھوپھی اماں
اپنے شفقو کا پیام فوزیہ کے لئے لے کر آئی تھیں۔

فوزیہ جو سچ مچ چاند کی رشتہ دار تھی ، بلیوں کی طرح سبز
آنکھیں ، جو لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلتی تھیں ، سنہرا رنگ جو ہنسی
اور غصہ میں دہکنے لگتا تھا۔ بھورے سنہری مائل گال
جن پر کبھی کبھی بھولے بسرے آنسو ٹھہر جاتے تو سچے موتیوں
کا شک ہوتا۔

فوزی جو پیلے اور گہرے فیروزی رنگ کی خوب لمبی
سی امریکن کار میں کالج جاتی تھی اور پڑھتی تھی کہ انسان
چاند پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے
لیکن پتہ نہیں شفقو نے کون سے کالج میں پڑھ لیا
تھا کہ زمین پر بھی ایک چاند ہے ، ورنہ اگر سچ مچ چاند

ہوتا تو سب سے پہلے شفق ہی اسے حاصل کرنے کے لئے لپک نہ پڑتا ؟

ابو نے جب گول مول باتوں میں پیام رد کر دیا تو ہر چند کہ انہوں نے اپنی امارت اور بہن کی عزت کا کوئی سوال نہ اٹھایا تھا، لیکن اس دن شفیق پر ساری دنیا تاریک ہو گئی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر سر جھکائے اپنے کمرے میں بیٹھا رہا ــــ ؛

دو ایک بار فوزیہ اُدھر سے آنکھوں میں خوشی دبائے گزری مگر بھی اس نے سر اٹھا کر نہ دیکھا، چاند دھیرے دھیرے اِدھر سے اُدھر ہو گیا۔ تارے ایک ایک کر کے غائب ہو گئے لیکن شفیق اسی طرح سرنگوں بیٹھا رہا۔

مہینے کے حسین اور خوشبودار پھول جن کا نہ جانے کتنے دنوں سے اس نے سہرا گوندھ رکھا تھا، سارے کے سارے مرجھا مرجھا کر ٹوٹ گئے اور وہ یوں ہی بیٹھا رہا جب صبح کی پہلی کرن اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو اسے احساس ہوا کہ رات ڈھل چکی ہے۔ وہ اپنے اس خیال پر خود ہی مسکرایا لیکن یہ کیسی رات ڈھلی ہے کہ روشنی کا کوئی گزر ہی نہیں ؛

" تم خدا نہیں تھیں، لیکن خدا کی طرح مجھ سے قریب تھیں میں اکثر سوچتا تھا کہ تم اگر پاس ہو تو دنیا میں کوئی غم نہیں ہے۔ لیکن تم زندگی میں اس طرح آئیں جیسے رات کی خاموش اداس تنہائی میں پھول کی خوشبو جسے سینے اور دل میں چھپا کر رکھ لینے کا یارانہ ہو ـــــ بھلا خوشبو بھی کبھی

قید ہو سکی ہے ؟؟
لیکن تمہارا چلا جانا تمہارے آنے سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھا۔ تم اس طرح چلی گئیں جیسے دھوپ دیکھتے دیکھتے غائب ہو جائے، جیسے روشنی ماند پڑ جائے۔ اُجالا کھو جائے۔ میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ تم جو کبھی ایک ہنسی کی طرح میرے ہونٹوں پر چھائی تھیں۔ آنسو بن کر میری آنکھوں، میرے دل سے نکل جاؤ گی، اب سوچتا ہوں واقعی تم خدا ہی کا ایک روپ تھیں، جو بظاہر بہت مہربان ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، لیکن دراصل کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ میں نے تمہیں دیا ہی کیا ہے جو تم سے کچھ مانگنے کا حوصلہ کروں، لیکن یہ میری خلوص بھری بددعا ہے کہ تمہارے کندن کی طرح دمکتے گالوں پر سدا سچے موتی جگمگاتے رہیں، اور یہ خلوص بھری بددعا بھی محض اس لئے ہے کہ ہو سکتا ہے اس طرح تم اپنے دل کی آگ ٹھنڈی کر سکو
میں یہ کیسے مان لوں کہ تمہارے دل میں میرے لئے کوئی آگ نہیں بھڑکے گی ؟ میں تمہارا دوست ہوں نا ؟ میں بھلا کب چاہوں گا کہ تم آگ میں جلتی رہو۔
فوزیہ تیسری بار اِدھر سے گزری تو شفیق کو چپ چاپ سگریٹ ٹکتے پایا۔
ایک لمحہ کو اس نے رُک کر فوزی کی طرف دیکھا تھا صرف ایک لمحہ کو اور شاید وہی ایک لمحہ تھا جس میں ساری دنیا آنسوؤں سے بھیگ گئی تھی، بچے بازار سے شاپنگ کر کے

ابھی ابھی لوٹے تھے اور مسلسل ایک ہی ریکارڈ بجائے جا رہے تھے۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا

اور جب فوزیہ تیزی سے پلٹ کر اپنے کمرے کو جا رہی تھی تو ہوا نے اس کے قدم پکڑ لئے ۔ تم خدا نہیں تھیں لیکن خدا کی طرح مجھ سے قریب تھیں۔

فوزیہ نے آنسو بھری آنکھیں اٹھائیں " وقت گزر جاتا ہے لیکن یادیں جہاں کی تہاں رہتی ہیں۔ کیسے کیسے گھاؤ دل کو سہنے پڑتے ہیں "

وہ اٹھ کر دریچے کے قریب آئی، موتیا کے پھول ہواؤں کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا، روشن چاند کے قریب ہی ایک ستارہ چمک رہا تھا فوزی کو بھولی بسری یاد نے آدبوچا۔

" یہ ستارہ ہے نا ؛ سنتی کیوں نہیں ؛ کام کی بات بتا رہا ہوں، یہ جو ستارہ ہے نا ؛ جب چاند سے بالکل مل جائے گا، اس دن قیامت آجائے گی !"

" لیکن شفو بھیا ، قیامت ہوتی کیسی ہے ؟"

" قیامت ؛ ارے تم نے قیامت نہیں دیکھی ، پھر یہ اور کیا ہے ؟"

شاہینہ نے پلٹ کر دیکھا، گہرے نیلے رنگ کی کریپ کی شلوار اور اسی رنگ کے کرتے اور اسی رنگ کے کرتے اور دوپٹہ میں ملبوس فوزی گلاب کی کلیاں چن رہی تھی، اس

نے حیران حیران لگا ہوں سے دونوں کو دیکھا، شاہینہ ہنس کر بولی۔

"اری بجّو، آپ نے سنا، شفّو بھیّا آپ کو قیامت کہتے ہیں —"

فوزی کا چہرہ گہرا سنہری ہو گیا "تمہارے شفّو بھیّا تو جوش میں آئے کہتے رہتے ہیں، وہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ چاند زمین پر موجود ہے"

"تو کیا جھوٹ کہتا ہوں؟"

وہ جان بوجھ کر فوزیہ کے قریب آگیا

"آپ سے سچ کہنے کی امید ذرا کم ہی رہتی ہے۔"

"لیکن اللہ قسم ایک بات کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا"

وہ خالص فوزی کے لہجے کی نقل کرتے ہوئے بولا

"وہ کیا — ؟" وہ ہنس کر بولی۔

"یہی کہ خاکسار آپ کا سچا عاشق ہے"

"بالکل تھرڈ کلاس عاشقی ہے" فوزیہ منہ بنا کر بولی۔

"پچھتائیں گی، یاد رکھیے گا"

"آپ بھی کوئی بھلانے کی چیز ہیں؟" وہ ذرا طنز سے بولی تھی۔

اور اب وہ، وہی تو تھا جو رہ رہ کر یاد آرہا تھا۔ فوزیہ نے کب سوچا تھا کہ وہ ہنسی ہنسی میں جی ہار جائے گی، وہ کھلنڈرا سا لڑکا جو اپنے کمرے میں پڑھتے پڑھتے اچانک بچوں میں جا کر کودنے پھاندنے لگتا تھا۔ جو پڑھائی نے

بی چراکہ ، آم کے درختوں پر چڑھ کر ناول پڑھا کرتا تھا۔ جو اکیلے میں بالکل فلموں کی طرح ڈائلاگ بولنے لگتا تھا، اچانک اس طرح اس کے ہوش و حواس پر چھا جائے گا کہ اس کی یاد کے ساتھ ہی آنسو نکل آیا کریں گے۔

" میں تمہاری طرح اتنا خوبصورت ہوتا تو آنکھوں کے پانی پر موتیوں کا دھوکا ہوتا تو خدا کی قسم موتیوں کی دکان کھول لیتا۔"

لیکن اب اس کی بلوریں آنکھوں میں کتنے ہی موتی چھپے تھے کہ وہ چاہتا تو ان کا سہرا گوندھ سکتا تھا۔ لیکن وہ موتی سمیٹنے والا کہاں تھا!

پتہ نہیں کیسے اسے علم ہو گیا کہ ماموں جان نے پیام صرف غربت کی وجہ سے ٹھکرا دیا۔ بس وہ دن اور آج کا دن ـــــ اس کی کسی کو خبر نہ ملی کہ کہاں چلا گیا۔

دور دیس کو چلے جانے والے کبھی یہ نہیں سوچتے کہ درد کی سوغات سنبھالنا کتنا کٹھن ہوتا ہے، اس نے کھڑکی میں کھڑے کھڑے نیلے آسمان کو تکتے ہوئے انتہائی دکھ کے ساتھ سوچا۔

پھر ایک ایک کر کے سب موسم آئے اور چلے گئے۔ وہ جان لیوا موسم بھی گزر گیا۔ جب شام کو بادل جھومتے تو ملگجا اندھیرا چھا جاتا۔ اور کسی نہ کسی کونے سے نکل کر وہ سرگوشی میں پوچھتا۔

" میں نے کیا خوبصورت بی بی! آپ نے کہیں اپنی زلفیں

تو نہیں کھول دی ہیں جو فضاؤں میں ایسا اندھیرا رچ گیا ہے۔"

جھم جھم مینہ برساتی سہ پہریوں کو وہ کسی آم کی شاخ سے کود کر کپڑے نچوڑتا ہوا اس کے قریب آتا۔

"شکر ہے آپ پگلی جنگی ہیں، ورنہ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ موتیوں کی برسات کہیں آپ کی حسین آنکھوں کا فیضِ عام تو نہیں!"

اور پھر جاتی سردیاں اور آتی گرمیاں، ہائے وہ یادوں سے بوجھل موسم، موتیا کی ادھ کھلی کلیوں سے جب ساری فضائیں مہک جاتیں، اندھیرے میں تاروں کی طرح چمکتے ہوئے گول گول پھول جھومتے۔

تب کیسے کیسے اسے اس غیر اہم سے لڑکے کی یاد آنے لگتی جو کبھی اس کے لئے کوئی حقیقت نہ رکھتا تھا۔ اور پھر بھی سب کچھ تھا۔ وہ کیسے اسے بھولے گی: کیسے اپنے دل کو تھامے گی۔

شادی کے ہنگامے اپنے عروج پر آجائیں گے اور سارے گھر میں دھوم دھڑکا ہو جائیگا۔ اس وقت اس کا اپنا دل کتنا ویران ہوگا وہ کیسے زندہ رہے گی؟

ابو کتنے خوش ہیں بارہ سو روپے ہوتے بھی تو بہت ہیں، جبکہ ان کے ساتھ ایک بنگلہ اور گہرے ہرے رنگ کی پلے متھ کار بھی ہو، لیکن کبھی کبھی ایسا سوچنا بھی تو خوشگوار معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹا سا ایک گھر ہو، جسمیں گیرج ہو نہ صوفے، نہ بھاری بھرکم پردے ہوں نہ پیانو، بس ایک

شفیق سا چہرہ ہو محبت کرنے والا ،
جو بچوں کی آنکھ بچا کر اندھیرے اُجالے، کونے کھدرے کندھوں سے پکڑلے ، اور اپنی گرم گرم سانسوں کا شہد کانوں میں گھولتے ہوئے بولے۔
"اللہ قسم تم تو پوری قیامت ہو!"
اس نے اپنے تپتے ہوئے چہرے پر ہاتھ پھیرا، چمکتے آنسو، پانی کا روپ دھار کر اس کے ہاتھ کو بھگو گئے۔ کھلا کھلا آسمان جو شفو کی یاد دلاتے تھے پیلے اور سوکھے پتے اِدھر اُدھر اڑتے پھرر ہے تھے ، اس کا دل بھی اپنی جگہ پر نہ تھا۔
اندر شاہنہ بے سری تانوں کے ساتھ الاپ رہی تھی۔
پتہ ٹوٹا ڈال سے لے گئی پون اڑائے
اب کے بچھڑے کب ملیں گے دور پڑیں گے جائے
وہ کھڑکی میں بیٹھے بیٹھے بہت دیر تک ان درد بھرے بولوں کو دہراتے ہوئے گنگناتی رہی۔
پتہ ٹوٹا ڈال سے .....
پتہ ٹوٹا ڈال سے .....
اور پھر یہ سب کچھ ایسے ہوا جیسے خواب میں ہوتا ہے۔
وہ اس رات آم کے مضبوط تنے سے لگی کھوئی کھوئی تھی کہ کسی کی گیلی گیلی آواز نے اسے چونکا دیا۔
" میں یہاں ہر چیز چھوڑ گیا ۔ سوچا صرف ایک ہی چیز کیوں ساتھ لیتا جاؤں ؟ آج واپس کرنے آیا ہوں ، اپنی امانت سنبھال لو ۔"
اس نے اپنا مضبوط ہاتھ سامنے کر دیا۔

اس نے پھٹی پھٹی حیران آنکھوں سے اسے دیکھا، یہ کون تھا جو اسے الاہنے دینے آیا تھا، یہ کون تھا جو اس کی زندگی کا درد سمیٹنے آیا تھا۔ اس کے ہونٹ کومل کومل ننھی پتیوں کی طرح کانپنے۔

"لیکن تم ایک امانت لوٹا بھی دوگے تو وہ سب کچھ کیسے لوٹاؤ گے جو میں اب تک ہتھارے......"

آواز اس کے گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔

شفوؔ حیران سا اس کے قریب آکر بولا۔

"فوزی! میں جان کر تمہیں دکھ دینے نہیں آیا، راستے میں تمہارا شہر پڑتا تھا، سو چا وہ درد کی سوغات دیتا چلوں...

جس نے چار برسوں میں کبھی ایک لمحے کو بھی مسکرانے کا موقع نہیں دیا...

یہ تمہاری وہ تصویر ہے جو میں نے باغیچہ میں کھینچی تھی.... تم ہنا کر اپنی سیاہ زلفوں کو جھٹکار ہی تھیں۔

وہ جھک کر بولا

"شفیق! اب وہی سیاہی میرا مقدر بن گئی ہے"

وہ روہانسی آواز میں بولی۔

وہ ذرا الجھ کر بولا

"تم نے .... خود اندھیروں کو گود لیا ہے .... شکایت کیوں کرتی ہو اب؟"

وہ قدرے رکا ـــــ، پھر سر اٹھا کر آسمان کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"ان بادلوں کا بھی کوئی بھروسہ نہیں، نہ جانے کب اور کہاں برس پڑیں، تو میں چلوں؟"

اس کے ساتھ ہی فوزیہ نے بھی سر اٹھا کے آسمان کو دیکھا۔

اس کے چہرے پر نور سا چھا گیا ـــــ قدرے مسکرا کر بولی:

"شفو!.....

"ایک بار تم نے کہا تھا کہ جب یہ ستارہ چاند سے بالکل مل جائے گا تو قیامت آجائے گی!"

شفو نے حیران حیران نگاہوں سے اسے دیکھا اور کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ ــــ،

فوزیہ تیزی سے آگے بڑھی۔ اور اپنی ساڑی کے آنچل سے اس کی راہ روکتی ہوئی بولی۔

" میں خدا نہیں ہوں اور نہ خدا ہو کر تمہاری آنکھوں سے اوجھل رہنا چاہتی ہوں!.....

کیا تم بھی اس بات سے خوش نہیں ہو شفو کہ ہم محض انسان ہیں..... جو!

ایک دوسرے کو نہ صرف دیکھ سکتے ہیں بلکہ چھو بھی سکتے ہیں؟"

شفو نے حیران ہو کر پہلے فوزیہ کو پھر آسمان کو دیکھا.....،

جہاں چاند اور ستارے کو ایک بدلی نے اپنے اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا۔

چھنال

"رنڈی اور چیچک نکلے بغیر نہیں رہتے ـــــ میں تو پہلے ہی کہتی تھی ـــــ"

اماں بی نے دھڑاک سے پاندان بند کیا۔ زور سے۔ پانوںکی ٹوکری لڑھکائی۔ اور صابرہ میاں کی طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھا، جو دونوں ہاتھوں میں سر تھامے، غم اور ندامت کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔

"مونڈی کٹی، کوٹھے کی چھنال آخر چھنال ہی نکلی نا ـــــ ارے کوئی گھرے کی خبر تو لو ـــــ کہیں زر زیور پر ہاتھ صاف کرکے تو نہیں نکل گئی اپنے کسی دھگڑے کے ساتھ ....

"اماں ـــــ"

زہرہ نے کچھ کہنا چاہا مگر لب نہ کھل سکے۔

صابر میاں کو کوئی چھرے سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا تو بھی شاید ہی قطرہ بھر خون نکل پاتا ـــــ کیسی بھد ہوئی تھی !! کیسے بڑے بڑے دعدے، اور کیسی کیسی تعریفیں اماں کے سامنے کی تھیں اور اب ـــــ ؟

خالی کمرہ اُن کا منہ چڑا رہا تھا ـــــ

رنڈی کو گھر بٹھا لینا کوئی معمولی بات ہے بھی نہیں۔ بڑے بڑوں سے سنتے آئے ہیں، لاکھوں کا گھر خاک کرنے والی کیا کسی کے گھر کو جائے گی۔

لیکن صابر میاں کا دل آیا بھی تو کس بر دہ ٹکے کی کوٹھے والی پر ــــ! گانا سننے ناچ مجرے دیکھنے تو ہزاروں ہی دل والے کوٹھوں پر جاتے ہیں، لیکن یوں کوئی دل نہیں ہارتا ــــ اور یہ بے چارے پہلے تو کبھی کوٹھے پر گئے بھی نہیں تھے ــــ!

بس اپنے ایک دوست کی شادی میں ہی تو گئے تھے۔ وہاں آگرہ کی کسی گوہر جان کا مجرہ بھی ہونے والا تھا۔ آج کل تو موافیشن ہی چل نکلا ہے کہ شادی بیاہ میں رنڈیاں بلواتے ہیں ــــ مجرے کرواتے ہیں ــــ اور اچھے اچھے شریفوں میں یہ سب ہو رہا ہے اور لوگ برا مانتے بھی نہیں ہیں یہ تو بڑے پن کی دلیل مانی جاتی ہے۔ جس شادی بیاہ کی محفل میں سلیقے سے چنے گئے گدوں پر سفید سفید چاندنیوں، کامدار مسندوں اور جگمگاتے گاؤ تکیوں کے سہارے بیٹھی ہوئی "بیگمات" اپنے گلے کے سُر نہ جگائیں اور گھنگھرؤ نہ چھنکائیں وہ محفل ہی کیا ہوئی ــــ

گوہر جان کو دیکھا تو صابر میاں کا دل اپنی جگہ چھوڑ بیٹھا۔ ــــ لوگوں نے دیکھا نہ محسوس کیا، یہ تو دل بہلانے کی چیزیں ہیں ــــ کوئی یوں جی تھوڑے ہی ہار بیٹھتا ہے مگر وہ اپنے جگری دوست انور سے دل پکڑ پکڑ کر کہہ رہے تھے ــــ

"یار اس آگرہ والی نے دل میں گرہ ڈال دی ہے ــــ"

پھر انور کے ساتھ ایک بار اس کے کوٹھے پر گئے
وہی مخصوص ماحول جس کے بارے میں قصہ کہانیوں
میں پڑھا تھا، وہی بائی جی ـــ وہی استاد جی ـــ
وہی ساز ندے ـــ وہی فرش فروشش، وہی گاؤ تکئے،
چاند نیاں اور اس پر بیٹھی ہوئی روایتی طوائف ـــ لیکن
اللہ جانے کیا بات تھی کم بخت میں، دلبری کے سارے انداز
ختم تھے اس پر ـــ
ایک نگاہِ غلط انداز سے انہیں دیکھا اور اپنے دوسرے
چاہنے والوں کی طرف متوجہ ہو گئی ـــ جیسے کہتی
ہو ـــ،
"اور مرد ہم پہ ـــ لیکن ہمیں تمہاری کب پروا
ہے ؟"
سامنے ہی سنار زیورات کے ڈھیر سارے ڈبے
کھولے بیٹھا تھا ـــ بیگانی انداز سے ایک ایک زیور
کو دیکھتی اور " اونہہ " کہہ کر پرے رکھتی جاتی ـــ پتے
جڑی ایک انگوٹھی کو ذرا غور سے دیکھا تو بائی جی جھٹ
پٹ بن سے بولی ـــ
" بیٹی انگوٹھی انگوٹھی کر کے میری جان کھانے جا رہی
تھی اب پسند آ گئی ہے تو لے کیوں نہیں لیتی ـــ" اور
بائی جی نے سامنے بیٹھے ہوئے اکبر سیٹھ کی طرف لگاوٹ
سے دیکھا۔
" ارے لے بھی لو ـــ "

اکبر سیٹھ لاپروائی سے خوش دلی کے ساتھ بولے۔
"ان انگلیوں میں تو پتے اور ہیرے کی انگوٹھیاں ہی سجتی ہیں ۔۔۔"

"میری اتنی باط کہاں ۔۔؟" وہ بناوٹی بھولپن سے بولی۔

"ارے میری جان ۔۔۔ ہزار بارہ ہزار کی انگوٹھی میں تمہاری باط کہاں سے آکر اٹک گئی ۔۔۔ پسند تو کرلو ۔۔۔"

سنار نے چودہ ہزار اور گیارہ ہزار کی دو انگوٹھیاں دمکتی انگلیوں میں پھنسا کر دیکھیں، بالکل برابر تھیں، اکبر سیٹھ نے اپنی دکان کا کارڈ نکال کر سنار کے آگے کو پھینکا ۔۔۔ "دکان سے روپیہ اٹھالینا ۔۔۔ ہمارا نام بتادینا ۔۔۔"

ابھی چاندی کے پنجے سے جس میں دو جگہ مگر کرتی، انگوٹھیاں دمک رہی تھیں، اس نے حاضرین کو جھک جھک کر آداب کیا اور صابر میاں وہیں ڈھیر ہوگئے ۔

"کہاں وہ اور کہاں تم ۔۔۔ میاں کوئی اور دوسری، چوکھٹ دیکھو ۔۔۔"

ان کے دل نے انہیں سمجھایا، مگر دل اب ان کے قابو میں تھا ہی کب ۔۔۔ اور ایسے کتنے دل تلوؤں تلے بچھے پڑے تھے۔

انور نے ایک دن انہیں بیٹھ کر سمجھایا۔

"ارے میاں یہ رنڈیاں صرف پیسہ بٹورنے کے لئے ہوتی ہیں، انہیں کسی سے محبت نہیں ہوتی، صرف پیسہ ہی ان کا مذہب ہوتا ہے ــــ تم کہاں اس کے چکر میں پڑ رہے ہو ــــ تم دیکھتے نہیں سبھی کی طرف وہ اسی محبت بھرے انداز سے دیکھتی ہے جیسے تم اپنے کو مخصوص سمجھ رہے ہو ــــ"

لیکن صابر میاں اس کی اس دن کی حیا اور ایک نگاہ کو بھول نہ پاتے تھے۔

اس دن وہ اکیلے ہی اس کے کوٹھے پر چلے گئے تھے ــــ ابھی لوگوں کی آمد شروع نہیں ہوئی تھی ـ یہ پہلے تھے، کامدار مسند پر پری بیٹھی ہوئی تھی، یہ پاگلوں کی طرح بڑھے، مسند سے ذرا ہٹ کر اس کی گہرے سرخ رنگ کی کارچوبی کام کی چڑھانوں میں پاپوشیں پڑی ہوئی تھیں۔

انھوں نے بے تابی سے اپنے جوتے اتارے ایک جوتا، تڑپتا ہوا اڑا اور جوتی پر اوندھا پڑا۔ انہوں نے جوتے کو ایک نظر دیکھا اور بڑی تڑپ سے بولے۔

"کس قدر خوش نصیب جوتا ہے!"

گوہر جان نے ایک نظر وہ منظر دیکھا اور شرم سے تپ گئی ــــ منہ پھیر کر بولی۔

"بڑے بے ہودہ ہیں جی آپ ــــ"

مارے حیا کے اس کی آنکھیں اٹھ نہیں پارہی تھیں۔ یہ انداز تو صابر میاں کو بالکل ہی مار گیا ــــ شرم تو

صرف شریف عورتوں کا زیور ہے ــــ یہ بھی شریف عورت ہے اور خاندانی اور حیا والی ــــ لوگ یونہی بکتے ہیں، وہ ادھر آکر اس کے قریب گھس بیٹھے۔

"قسم خدا کی ــــ مت آزماؤ! مت آزماؤ ــــ چین نہ پاؤ گی ــــ بن موت مرجاؤں گا ــــ"

"جو دل نہیں کہتا وہ زبان سے کیوں کہتے ہیں آپ؟ کیا واقعی شیطان کے کان بہرے، حضور مرجائیں گے۔"

اس انداز پر تو وہ اور بھی فدا ہو گئے تڑپ کر بولے

"کیا ابھی زندہ نظر آتا ہوں ــــ؟"

وہ ایک ایسی ہنسی ہنسی جو اگر آسمان سے گرے تو ہری بھری کھیتیوں تک کو جلا کر راکھ کر دے ــــ

وہ تڑپ کر بولے ــــ "ہنستی ہو ــــ کیا جھوٹا نظر آتا ہوں تمہیں ــــ"

وہ مسکرائی ــــ "اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھئے،" وہ بہرحال مرد تھے، شرارت پر اتر آئے ــــ ہنس کر بولے ــــ "تم اپنے گریبان میں منہ ڈالنے دو تو ایک بات بھی ہے، چاند سورج کے نظارے ہی ہو جائیں گے ــــ میرے گریبان میں کیا دھرا ہے ــــ"

اس نے شرم سے تڑپ کر اپنے دونوں گورے گورے ہاتھوں میں چہرے کا چاند چھپالیا ــــ

"اللہ ــــ کتنے بے حیا ہیں آپ ــــ یوں بھی کوئی کہتا ہے ــــ"

بس یہ شرم ان کی دنیا لوٹ لے گئی۔ بے شرمی نے سالتے گھر نہیں اُجاڑے جتنے اس نامراد شرم نے دہ بس الور کو ہر مرکہ یہی سناتے جاتے تھے ــــ

"نہیں یار تمہیں پتہ نہیں وہ بڑی، شرم و حیا والی، گھریلو بی بی بن کر رہنے والی عورت ہے، پتہ نہیں کیسے اس جنجال میں پھنس گئی ــــ"

"مرد جب خود کسی جنجال میں پھنسنے والا ہوتا ہے تو اسی طرح کی باتیں کرتا ہے ــ"

انور بیزار ہو کر بولا۔ مگر دہاں تو بس ایک ہی رٹ لگی ہوئی تھی۔

دو یا تین ملاقاتیں زندگی کی مول بن کر رہ گئیں، لیکن آخری ملاقات میں تو وہ بالکل ہی پاگل بن بیٹھے ــــ

کسی رئیس دوست کے ہاں سالانہ محفل جمتی تھی جس میں ہر بار کسی نہ کسی جلت پھرت والی طوائف کو بلایا جاتا تھا۔ اب کے بار قرعۂ فال گوہر جان کے نام پڑا ــــ رات بھر کی محفل تھی ــــ صاحب میاں کیسے چوکتے ــــ بنا پلک مارے، سب کے سامنے والی قطار میں بیٹھے، رات بھر اسے نہارتے رہے ــ

ادھر موذن اذان کے لئے منبر پر چڑھا اور ادھر گوہر جان نے ہارمونیم بڑھایا ــــ رات بھر کے تھکے ماندے، کوئی اپنے گھر سدھارا اور کوئی وہیں پڑا رہا۔

سازندے ہاتھ پاؤں سیدھے کرنے لگے ــــ جس کو

جہاں جگہ ملی وہیں پڑ رہا ـــــ موٹے موٹے گدیلوں پر سفید سفید چاندنیاں لگی ہوئی تھیں ـ تکئے قرینے سے ، دھرے ہوئے تھے ـــ

پھوارتیں برس رہی تھیں ، تکان اس پر سے رات بھر کی جگار ـــــ آنکھوں میں نیند اتر آئی تھی صابر میاں کو جگہ بھی ملی تو گو ہر جان کے قدموں میں ـــــ جنے کتنی راتوں کے جگے ہوئے تھے کہ محبوبِ دلنواز کے قدموں میں جگہ پاتے ہی بے سدھ ہو گئے ـ

آنکھ کھلی تو کاہے سے کھلی کہ کسی کے ٹھنڈے ملائم ہاتھ ان کے پیروں کو چھو رہے تھے ـــــ جیسے جنموں کی نیند سے آنکھ اچٹ گئی ـــــ کانوں میں شہد سا برس رہا تھا ـ

" ہائے ! ایسے بھی کوئی نہ سوئے ـــــ ملل کے نامراد کرتے میں جان کیا کہہ رہی ہوگی ـــــ او پر سے پیروں میں پاتا بے بھی نہیں ـــــ اور انہوں نے خود دیکھا تھا کہ پیروں کو ہاتھوں سے چھو کر اس نے اپنے دوپٹے کو ان کے پیروں کے گرد مڑھ دیا تھا ـــــ کہ پیر ذرا گرم ہو جائیں ـــــ

" یہ ادا ـــــ یہ خدمت گذاری اور ہمدردی کی ادا تو صرف ایک بیتی ورتا ، گھریلو اور محبت والی بیوی ہی میں ہو سکتی ہے ـــــ "

انھوں نے اپنے ہزار تردید کرنے والے دل کو سمجھایا

تھا ـــــ اور پتہ نہیں یہ اُن کے اپنے تڑپتے دل کا اثر تھا یا گوہر جان کو بھی صابر میاں پسند آ گئے تھے، کہ وہ کوٹھے سے اترنے پر راضی ہو گئی ـــــ

یہ الگ داستان ہے کہ وہ کس طرح اپنی ماں کو منا پائے (جو سید زادی تھیں) ـــــ سید صاحب کی بیوی تھیں اور پنج وقتہ نمازی تھیں اور اعتکاف میں بیٹھتی تھیں اور مریمی روزے رکھتی تھیں ـــــ شاید مذہب سے حد درجہ بڑھا ہوا لگاؤ ہی تھا جو انہیں وہ زیر کر سکے ـــــ کہ "اماں گنہ گار جب توبہ کر لے تو خدا کے نزدیک وہ اتنا ہی معصوم اور مقدس بن جاتا ہے جتنا کہ ابھی ابھی پیدا ہونے والا بچہ ـــــ اور اماں یہ تو سوچیے کہ وہ جو اپنی یہ مکروہ اور گھناؤنی زندگی چھوڑ دینے پر آمادہ ہوئی ہے تو خدا نے ہی اسے راستہ دکھایا ہوگا نا ـــــ ؟ تو جسے خدا راستہ دکھا رہا ہے اسے آپ کیوں گمراہ کئے دیتی ہیں ـــــ ؟"

"ارے بیٹا ـــــ جو پاؤں ایک بار مجرے کے لئے کھڑے ہو چکے ہوں وہ کبھی کسی گھر میں نہیں ٹک سکتے ـــــ ہزاروں کا منہ دیکھی ہوئی عورت ایک مرد سے مطمئن نہیں ہو سکتی تم مانو یا نہ مانو ـــــ ان آنکھوں نے تو یہی دکھایا ہے کہ رنڈی اور چھینک نکلے بغیر نہیں رہتے لاکھ روکنے کی کوشش کرو ـــــ"

لیکن اکلوتے بیٹے کی آہ و زاری کام آئی ـــــ اور اماں بی کا کہتا ہی کون ـــــ ؟ لے دے کے ایک بیٹا اور ایک بیٹی.

میاں تو مدّت ہوئی اللہ کو عزیز ہو چکے تھے۔
بیٹی تھی اس کی بھی منگنی ہو چکی تھی، آج نہ کل اپنے گھر جانے ہی والی تھی اور بیاہی بیٹی آئی بھی تو چند روز کے لئے۔ اس کا ساتھ ہی کیا ـــ سوٹ تو بیٹے سے ہی بھتی ہے اور اپنے جان کے ٹکڑے لاڈلے بیٹے سے بگاڑ کر کے رہتیں بھی کیسے ـــ ؟ اور جو کبھی اکتا کر زہر وہر ہی کھالیتا تو کہاں کی رہتیں۔؟
گو ہر جان دلہن بیگم بن کر گھر میں آگئیں ـــ زہرہ نے تو بھابی، بھابی کر کے ہاتھوں لیا، لیکن اماں بی نے بازو کے کمرے سے اتنی زور سے بیٹی کو سنایا "رنڈی اور چھلک لیکے بغیر نہیں رہتیں ـــ دیکھ لینا صابر میاں کی ناک کٹا کے ایک دن نکل بھاگے گی ـــ "
کہ دلہن بیگم کا ننھا سا دل چور چور ہو گیا۔
زہرہ بولی۔
"اماں خدا کے لئے ایسا نہ کہیئے، بھابی کو دکھ ہوگا اگر سن لیا تو ـــ "
اماں بی غصّے سے بولیں۔
"اے شریف زادی کو شریف زادی کہینگے تو رنڈی کو بلا شبہ رنڈی کہیں گے، اس میں دکھ کی کون سی بات ہوئی ـــ "
کوٹھے پر پلی بڑھی، ہزاروں کے مجمع میں رہی تھی، تلووں تلے لاکھوں دل کچلنے والی کی پہلی صبح بڑی

عجیب و غریب، نکلی ـــ

صبح ہی صبح چھ بجے سے اماں بی کے وضو کرنے، کھانسنے، پھر نماز کے بعد تلاوت کرنے کی آوازیں۔ پھر زہرہ کے وضو نماز تلاوت کی گنگناہٹ۔

"اللہ میں بیاہ کر سسرال آئی ہوں یا کسی مسجد میں آگئی ہوں ـــ" اس نے گھبرا کر سوچا۔ لیکن پھر توبہ توبہ کر کے خود ہی برے خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا۔ بازو دیکھا تو صابر میاں جو رات بھر "شراب ناب" کے غٹاغٹ پیالے چڑھاتے رہے تھے بے سدھ سوئے ہوئے تھے۔

"اٹھئے حضور......" اس نے کندھا پکڑ کر ہلایا۔ پھر وہ خود ہی چونک اٹھی۔

"نہیں ـــ یہ قبلہ اور حضور جیسے الفاظ کو پٹکے کے لغات میں تھے، اب مجھے شریف اور گھریلو عورت کی طرح "اے جی ـــ سنیئے تو ـــ" کہنا چاہیئے ـــ"

اس نے دوبارہ سے انہیں ہلایا

"اجی سنیئے تو ـــ کب تک سوتے رہیں گے۔ کام وام پر جانا ہے یا نہیں ـــ"

انہوں نے چندھیائی ہوئی آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور شرارت سے اسے اپنے بھاری جسم تلے دبوچ لیا۔

"آہاں کام ـــ اس سے زیادہ ضروری کام کون سا ہو سکتا ہے بھلا ـــ؟؟"

پہلا ہی دن سمیتوں کا دعوت نامہ لے کر آیا ــــ وہ اور زہرہ نہا کر بال سکھانے چھت پر نکلیں تو سامنے کے بنگلے والا اپنی چھت پر کرسی ڈال کر کوئی کتاب پڑھتا بیٹھا تھا ــــ دلہن بیگم کو کمرہ اوپری منزل پر ملا تھا ــــ اور کمرہ اس ڈھب کا تھا کہ بے حد شاندار کمرے سے ملی ہوئی سنگ مرمر کی چھت ــــــ

لگی ہوئی تھی، بیچ میں مونڈھے اور صوفے پڑے تھے اور ساتھ ہی ایک بڑی میز بھی چائے پانی رکھنے کے لئے رکھی ہوئی تھی ـ

منڈیروں پر خوب صورت پھولوں اور ننھے ننھے پودوں والے گملے سجے ہوئے تھے ــــ صابر میاں خوشحال آدمی تھے، شہر میں بڑا کاروبار تھا ــــ ذاتی دو منزلہ بنگلہ تھا، کسی چیز کی کمی نہ تھی ــ

کنوارپن سے ہی وہ اوپری منزل پر رہتے تھے، چھت بھی انہی کے استعمال میں تھی ــــ شادی ہوئی تو ظاہر ہے کہ دلہن بیگم بھی وہیں رہیں ــــ

سامنے والا شاید کسی مجرے میں گوہر جان کو دیکھ چکا تھا ــــ پہلے تو اس نے اچٹتی نظر سے دیکھا، پھر صورت شناسا تھی تو ذرا غور سے دیکھا ــــ پھر پوری طرح پہچان کر ذرا ہنس کر دیکھا اور پھر ایک ہلکی سی سیٹی بجانے لگا ــــ ؛

دلہن بیگم نے سیٹی کی آواز سن کر سر اٹھایا تو وہ ہنس کر بیہکڑ پن سے بولا۔

یہ میری جان ایسی بھی کیا بات ہے ــــ بنا کر اس چھت

پر بال سکھا رہی ہو ــــ پیسہ اور جوانی تو ہمارے پاس بھی فراغت سے ہے، ہمارے نصیب کیوں نہ کھولے ـ"

زہرہ نے بھابی کو ذرا گھبرا کر دیکھا جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں ــ اک دم دلہن بیگم نے زہرہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور بولیں۔

"بی بی اب سے یہاں نہیں آئینگے ہم ــــ اچھے لوگ نہیں ہیں اس بنگلے کے ــــ"

اس آدمی نے جو دونوں کو جاتا دیکھا تو ذرا زور سے بولا ــــ،

"ارے تم تو سلی کچلی تھیں، ذرا اس منہ بند کلی سے تو میل کرا دو رانی ــــ"

یہ اشارہ صاف زہرہ کے لئے تھا۔

دلہن بیگم کو پسینہ آگیا ــ آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا ــ کمرے میں آتے ہی دھڑ سے مسہری پہ گر پڑیں سسکیوں سے بدن ہلنے لگا

"بی بی ــ میں تم جیسے شریف لوگوں کے لائق نہ تھی..... میری وجہ سے تمہاری زندگی.....

"بھابی ــــ"

زہرہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"آپ بیکار کی باتیں کیوں سوچ رہی ہیں ــ یہ سامنے کے بنگلے والے تو یونہی بے کار سے لوگ ہیں اس لئے تو ہمارا اُن سے کوئی میل جول نہیں ہے ورنہ پڑوسی تو رشتہ داروں سے بڑھ کر ہوتے ہیں، بھائی جان نے شروع ہی

سے ان لوگوں سے تعلقات نہیں بڑھائے، اسی اوچھے پن کی وجہ سے ___ آپ اپنا دل کیوں برا کرتی ہیں ___ "
" نہیں بی بی ؛ تم نہیں سمجھو گی ___ میری رسوائی اگر میرا بچپانہ بھی کرے تو میری بدنصیبی میرا پتہ ڈھونڈھ لے گی ___ پھر میں کہاں چھپوں گی ؟"
بھابی آپ چپ کر جایئے خدا کے لئے ورنہ میں بھی رونے لگوں گی ___"
مگر دلہن بیگم کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے ___

چند روز اور گذرے ___ ایسی کڑھن اور کلفت میں گذرے کہ جس کی حد تھی نہ حساب ___
میاں تو داری نیاری تھے مگر اماں بی چپ رہتے، ہوئے بھی ہزار بول بول جاتیں ___
کھانا بھی انہوں نے اس ٹیبل پر نہ کھایا جس پر دلہن بیگم بیٹھتی تھیں ___ زہرہ کالج چلی جاتی ___ ورنہ انسی سے ذرا وابستگی رہتی ___
میاں کو ٹیل ٹیل کر یہ خود کام سے باہر بھیج دیتیں کہ جب تک وہ ___ اور یہ کمرے میں رہتے اماں بی کی غیر محسوس نگاہیں کلیجہ چھیدے ڈالتیں ___
کئی بار جی میں آیا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں بھی چل دیں لیکن ایک بار گناہ کی جس دلدل کو پھلانگ آئی تھیں اب ادھر کا رخ کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہ سکیں

تھیں ـــــ،

زہرہ کالج سے آ کر او پر چلی آتی تو اماں بی کے بکھان شروع ہو جاتے ـــــ

" اپنی تو زندگی کو برباد کر ہی ڈالی بہن کا ہی کچھ خیال کیا ہوتا ـــــ جب دیکھو تب منہ سے منہ لگا ہوا ہے پہلے تو میں چھت پر پھٹکنے بھی نہ دیتی تھی، اب تو جب دیکھو تب بھاوج ہیں نند ہیں اور بس چھت ہے ـــ "

دلہن بیگم حیران ہو کر سوچتیں کہ " اللہ زہرہ تو کبھی میرے پاس ہوتی بھی نہیں ـــــ پھر یہ الزام کیسا ہے ـــ ؟"

لیکن ایک دن پھوٹ سے دلہن بیگم کے جو دہ طبق روشن ہو گئے، بڑی عجیب اور انہونی سی بات تھی لیکن اس دن زہرہ مغرب کے وقت آئی تو ذرا گھبرائی ہوئی سی تھی ـــ دلہن بیگم سے لپٹ کر بولی ـــ

" ابھی بھابی میری ـــ اپنی کالے ہرے پھولوں والی ساڑی پہننے کو دیں گی آج ـــ "

" اے لو ـــ ، وہ ہنس، کر بولیں ـــ " یہ پوچھنے کی کون ضرورت آن پڑی ـــ بھابی کی چیز نند کی نہ ہو گی ـــ ؟! لے جاؤ اور جو جی چاہے شوق سے لیا کرو ـــ "

دو بجے کے کھانے پر صابر میاں بول گئے تھے کہ رات دیر سے آئیں گے کوئی میٹنگ تھی ـــ سب نے کھانا کھا لیا تھا ـــ دلہن بیگم میاں کے لئے بھوکی تھیں ـ گرمی ہو رہی تھی وہ چھت پر نکل آئیں۔

اک دم انہیں فضا میں کچھ نامانوسیت کا احساس ہوا۔ وہیں ٹھٹک گئیں ـــــ پچھواڑے کی چھت پر پانی کی ٹنکیوں کے پیچھے سے سرگوشی کی سی آواز اُبھری ـــــ :

"ہمت کیسے کی آج ـــــ"

"بھائی جان نے کہا تھا دیر سے آئیں گے"

"اور جو آ گئے ـــــ تو ـــــ" ساتھ میں بوسے کی آواز :

"اتنی بے وقوف نہ سمجھو ـــــ اسی لیئے بھابی کی ساڑی پہن کر آئی ہوں کہ جھپک لپک میں اماں یا بھائی جان دیکھ بھی لیں تو سمجھیں کہ بھابی تھیں ـــــ ان کے طوائف ہونے کا ایک فائدہ ہمیں بھی تو ملا ـــــ ... ملی جلی ہنسی کی دبی دبی آوازیں سن کر دلہن بیگم کا خون ان کی رگوں میں جمنے لگا۔ آوازیں پھر سے ابھریں ـــــ

"لیکن میں تو اب ترس گیا ہوں ـــــ صرف بوسوں سے اور یہ لپٹا لپٹی سے میری سیری نہیں ہوتی ـــــ کوئی موقعہ ـــــ؟"

"بھابی کی ساڑیوں کی عنایت سے مل ہی جائے گا ـــــ"

ہنسی کی پراسرار آوازیں۔

"دیکھو ٹال تو نہیں رہی ہو ـــــ"

"ٹالوں گی کیوں ـــــ کیا وہی میرے دل کی آرزو نہیں ہے؟"

"اچھا ہوا تمہارے بھائی ایک رنڈی کو بیاہ کر لائے ـــــ اس کی آڑ میں تو ہم کافی دنوں رنگ رلیاں منا سکے

ہیں ــــ کم سے کم تمہاری شادی تک ــــ
دلہن بیگم سے اور کچھ نہ سنا گیا۔

زہرہ بی بی ــــ یہ خط پڑھ کر فوراً ہی پھاڑ دینا خدا تمہیں خوش رکھے اور سیدھے راستے پر چلائے تمہاری منگنی ہو چکی ہے، اللہ کرے جلد ہی شادی بھی ہو جائے ــــ تم میری ساڑیاں اتنے شوق سے کیوں پہنتی ہو مجھے پتہ چل گیا ہے ــــ

میری زندگی جیسی بھی گذری ــــ گذر گئی ــــ رنڈی کی عزت ہی کیا ــــ لیکن تمہارے بھائی کی بیوی اور تمہاری بھابی بن کر میں نے اس گھر میں جو بھی عزت کے دن گذارے ان کا تقاضہ یہ تھا کہ میں تمہیں غلط راستے پر چلنے سے نہ صرف روک دوں بلکہ بچا بھی لوں ــــ

میری بدنامیاں تو وفادار کنیزوں کی طرح میرا دامن تھام کر عمر بھر میرے ساتھ چلیں گی ــــ میں تمہاری معصوم اور بے داغ زندگی کو یوں داغدار کرنے میں حصہ دار ہرگز نہیں ہوں گی ــــ

بی بی میری ساڑیاں اور چادریں استعمال کرو گی تو میلی تو میری ہی ساڑیاں اور چادریں ہوں گی ــــ لیکن تمہاری زندگی کی چادر پر جو داغ پڑیں گے وہ آب زم زم سے دھل کر بھی پاک نہ ہو پائیں گے ــــ

خدا اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے راستہ پر چلو ــــ

یہی میری نصیحت اور یہی میری دعا ہے ــــ
ایک بڑی بھابی ہونے کے ناطے ــــ
میں اس گھر میں سر جھکا کر، دلہن بن کر آئی تھی،
خدا گواہ ہے تمہارے بھائی کے ہاتھوں کے لمس کے بعد اس جسم کو صرف ہوا، دھوپ اور چاندنی ہی چھو سکی ہے ــــ
اور خدا کو پھر بیچ میں لا کر تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ باقی زندگی بھی جہاں کہیں میں رہوں، اس جسم کے چپے چپے پر صرف تمہارے بھائی کے جسم کے بے مثال محبت بھرے نقوش ثبت رہیں گے!
لیکن ــ!
ایسی پیاری محبت کو چھوڑ کر صرف اس لئے سر جھکا کر اس گھر سے جا رہی ہوں کہ تم سر اٹھا کر جی سکو ــــ تمہاری بھابی

میں تو پہلے ہی کہتی تھی ــــ اماں بی نے دھڑاک سے پاندان بند کیا، زور سے پالوں کی لٹ کری لڑھکائی اور ــــ!
کھا جانے والی نظروں سے صابر میاں کی طرف دیکھ کر کہا۔
"چھنال آخر چھنال ہی نکلی نا ــ۔"

چکر

ڈرائنگ روم میں خوب شور ہو رہا تھا۔ میں نے چپکے سے جھانکا تو دیکھا بھائی جان صوفہ پر بیٹھے ہوئے تھے، صوفہ کی دوسری طرف باجی بیٹھی تھی۔
ایک کرسی پر سلمیٰ بیٹھی مسکرا رہی تھی، دوسرے صوفوں اور کرسیوں پر رضیہ، ناہید، رفیعہ، زاہدہ، رفو، اور بھی دوسرے بچے شور مچانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔

"کیوں بھئی یہ شور کیوں ہو رہا ہے؟"
میں نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔
"ارے آؤ آؤ بس تمہاری ہی کمی تھی۔" بھائی جان مسکرا کر بولے میں رضیہ کے پاس بیٹھ گئی، لیکن پھر اٹھ کر بھائی جان اور باجی کے بیچ میں بیٹھ گئی۔
"بھئی مجھے میرے سوال کا جواب تو ملا ہی نہیں" میں نے سب پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔
"ارے بھئی ہم بیت بازی کرنا چاہتے ہیں، لیکن کون کس طرف رہے؟ یہ فیصلہ کرنا ہے، اور اسی لئے یہ شور ہو رہا ہے۔"
باجی نے مجھے پوری رپورٹ سنادی۔
"اونہہ ــــ بھلا یہ بھی کوئی کام ہے جس کے لئے

اتنا شور مچایا جائے ۔۔ ہم نے اپنی بڑائی جتائی ۔ سنو، بھئی میں، بھائی جان، اور باجی ایک .....۔"

"نہیں نہیں، ایسے نہیں، باجی ہمارے گروپ میں رہے گی،،

ناہید اور رفیعہ میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی پریخ اٹھیں۔

" اتنا چیخو نہیں۔۔ میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ " سنو ناہید، سلمٰی باجی اور فراز بھائی ایک طرف ؛ میں بھائی جان، رفیعہ، اور رضیہ ایک طرف !"

" ہاں بھئی اب ٹھیک ہے ،، ناہید نے میری تائید کی ___ ۔

" ہاں بھئی تو بیت بازی شروع کی جائے ۔ پہلا شعر کون کہے بھائی ؟"

" پہلا شعر محفل کا سب سے حسین شخص کہے ،، بھائی جان بولے، سب کی نظریں بے ساختہ باجی پر پڑیں، نظروں کی بے پناہ یورش سے گھبرا کر باجی اپنے پیر کے انگوٹھے کو قالین پر رگڑنے لگی۔

باجی تھی بھی واقعی بڑی سویٹ، اسے دیکھ کر خواہ مخواہ ندیم کے اشعار گنگنانے کو جی چاہتا، خصوصیت سے وہ قطعہ ؎

تیری زلفیں ہیں کہ ساون کی گھٹا چھائی ہے
تیرے عارض ہیں کہ پھولوں کو ہنسی آئی ہے
یہ ترا جسم ہے یا صبح کی شہزادی کے

ظلمتِ شب سے الجھتی ہوئی انگڑائی ہے

جب کوئی باجی کو چھیڑتا اس کا منہ سرخ ہو جاتا، اور شرما کر سر جھکا لیتی اس کی یہ ادا مجھے بےحد بھاتی، میرا دل چاہتا اسے ہمیشہ چھیڑتی رہوں۔ اور وہ سدا شرما کر سرخ ہوتی رہے سر جھکاتی رہے۔ باجی نے جھکی نگاہیں اٹھائیں، سب کو دیکھا اور بات بنانے کو بولی۔

"سلمیٰ کہہ دو" پہلا شعر"

"واہ یہ حق تو آپ کا ہے"،

سلمیٰ مسکرا کر بولی۔

"ہائے باجی، جلدی سے شعر کہہ دو نا"، کوئی اُکتا کر بولا۔

"پہلے شرط پر تو غور کرو ـــ"، باجی بن کر بولی، حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ محفل میں سب سے زیادہ حسین وہی ہے۔

"اللہ ری بےنیازی"،

فراز بھائی جو اب تک اس بحث سے الگ تھے باجی کو گھورتے ہوئے بولے

اس وار پر باجی ذرا جل کر بولی ؎

اندیشۂ خزاں بھی ہے گلچیں کا خوف بھی!

ہنستے ہیں پھر بھی پھول تو فطرت کا کیا علاج

بیت بازی عجیب انداز سے شروع ہو گئی۔

"کوئی جیم کا شعر کہو بھئی جلدی سے!" میں بولی۔

بھائی جان نے بہت ہی پیارا شعر کہا ہے

جنہیں تم کہہ نہیں سکتے، جنہیں ہم سن نہیں سکتے،
وہی کہنے کی باتیں ہیں، وہی سننے کی باتیں ہیں

اسی وقت رفو جو کسی کام سے اٹھ کر چلا گیا تھا پھر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔

"ارے بھئی رفو بھیّا! کوئی "ن" کا شعر کہو نا"

بھائی جان دس سال کے رفو کو بڑے مزے سے رفو بھیّا کہتے تھے۔ "کیا۔؟" رفو صاحب آنکھیں مٹکا کر بولے

"اجی صاحب آپ کی باجی کو "نون" کا شعر یاد نہیں ہے، کوئی شعر کہو۔"

"ذرا اردو میں کہو نا، ایسی انگلش کیوں بگھار رہے ہو؟"

یہ رفو کی خاص اصطلاح تھی، جب وہ کوئی بات اچھی طرح نہ سمجھ پاتا تو یوں ہی کہا کرتا۔

"ارے یار تم بھی الو کی دم ہو بس، ارے بے وقوف کوئی ایسا شعر پڑھ جس کا پہلا حرف "ن"۔ بھائی جان رفو کا سر ہلا کر بولے۔

"اوں ــ تو یہ بات تھی ــ سنو ــ" رفو صاحب نے انتہائی سادگی سے یہ شعر پڑھا ؂

ندی ہوں میں، نالہ ہوں میں
آفت کا پرکالہ ہوں میں

ایک فلک شگاف قہقہہ پڑا اور رفو جھینپ کر باہر بھاگ گیا۔

سلمیٰ نے "ن" کا شعر کہا ۔

نہ دے الزام اے ناداں زمانے کے حوادث کو
یہی فتنے تجھے ہر گام پر بیدار کرتے ہیں

میں نے سلمیٰ کے شعر کے جواب میں کہا ۔

نہ پوچھ مجھ سے مرے ہمنشیں خوشی کیا ہے
غم فراق کا رونا ہے زندگی کیا ہے

جلدی سے "ی" کا شعر کہو، ورنہ مات!" رضیہ نے ڈرایا۔ فراز بھائی نے ہڑ بڑا کر یہ شعر پڑھے ۔

یہ کس کا ڈھلک گیا ہے آنچل
تاروں کی نگاہ جھک گئی ہے
یہ کس کی مچل پڑی ہیں زلفیں
جاتی ہوئی رات رک گئی ہے

بھائی جان فراز بھائی کے جواب میں بولے ۔

یہ سیہ پھولوں کی ساری واقعی کیا خوب ہے،
اس پہ نکھرا نکھرا رنگ و دلکشی کیا خوب ہے

باجی غیرارادی طور پر شرما کر رہ گئی، اس نے سیاہ پھولوں کی ساری پہن رکھی تھی۔ فراز بھائی اپنی جگہ کسمسا کر رہ گئے۔

ناہید نے پہلی بار شعر دیا۔

یہ مے چھلک کے بھی اس حسن کو پہنچ نہ سکی
یہ پھول کھل کے بھی اس کا شباب ہو نہ سکا

میں نے جوابا یہ شعر کہا ہے

انگڑائی یہ کس نے لی ادا سے
کیسی یہ کرن فضا میں پھوٹی
کیوں رنگ برس پڑا چمن میں
کیا قوس قزح لچک کے ٹوٹی

باجی نے "ی" کا شعر کہا ہے

یونہی بیٹھے بیٹھے خیال آگیا
اگر تم نہ ہوتے تو دنیا نہ ہوتی

اور شعر پڑھتے پڑھتے باجی نے بھائی جان کو ایسی نظروں سے دیکھا گویا واقعی بھائی جان نہ ہوتے تو دنیا نہ ہوتی۔

فراز بھائی نے باجی کی یہ حرکت دیکھی۔ وہ تو پہلے ہی سے جلے بیٹھے تھے۔ اور بھی جل گئے غصہ اتارنے کو بہانہ تراشا :

"اختر! تم نے شعر غلط کہا ہے!"

باجی سمجھ گئی کہ فراز بھائی خواہ مخواہ غصہ دکھا رہے ہیں۔ قدرے چڑ کر بولی

"آپ کو معلوم ہو تو کہیئے نا صحیح شعر"

فراز بھائی جھلا کر بولے۔

"تو کیا میں جھوٹا ہوں ؟"

باجی اکتا کر بولی

"جھوٹا کون کہتا ہے لیکن صحیح شعر تو بتایئے"

فراز بھائی کو شعر کے غلط ہونے یا صحیح ہونے سے سروکار نہ تھا۔ انہوں نے اپنی جھنجلاہٹ یوں اتاری کہ پاس پڑا ہوا شیشے کا پیپر ویٹ باجی کے دے مارا اور بولے ۔

" لو یہ صحیح شعر ! "

باجی نے وار ہاتھ پر روکا تو اس کے ہاتھ کی تین چوڑیاں ایک چھنا کے ساتھ ٹوٹ گئیں ، اور خون بہنے لگا ۔

خون دیکھ کر بھائی جان تلملا گئے ۔

" یہ کیا کر دیا فراز ؟ "

بھائی جان تڑپ کر بولے ۔

" تم بیچ میں مت بولو جی ! " فراز بھائی نے ڈانٹ پلائی ۔

" بولوں کیسے نہیں ، اگر خون بھی کر دو تو نہ بولوں ؟ "

بات بڑھتی دیکھ کر فراز بھائی کمرے سے نکل گئے ، اور اچھی خاصی محفل درہم برہم ہو کر رہ گئی ۔

فراز بھائی تو ہمیشہ کے ضدی واقع ہوئے تھے ذرا سی کوئی بات مرضی کے خلاف ہوئی اور انہوں نے اکڑ دکھائی ۔

دادی اماں نے مرتے وقت باجی کا ہاتھ فراز بھائی کے ہاتھ میں دے دیا تھا ۔ مرنے والی کی آرزو کون نہ پوری کرتا ! باجی ان ہی کی ہونے والی تھی ۔

اور وہ اس بے جا و بے جا رعب کا مظاہرہ رہتے ۔ بیچاری

مجبور و بے کس باجی!! کئی بار آپ ایسی محفلوں کو بے رونق کر چکے تھے۔ جب سب خوش رہتے اس وقت فراز بھائی کوئی نہ کوئی ایسی بات کر بیٹھتے کہ جس سے سب گئے کرائے پر پانی پھر جاتا۔

گھر میں کون تھا جو ان سے خوش تھا؟

ایک دن ہم سب باغ میں بیٹھے تھے، جانے کس موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی، باجی بولی۔

"میں تو کبھی نہیں روتی، چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے ہمیشہ ہنستی ہی رہتی ہوں، کیوں ہے نا ناجو؟" اس نے مجھ سے تائید چاہی۔

"ہمیشہ کی بات تو شاید غلط ہو لیکن آپ عموماً ہنستی ہی رہتی ہیں۔"

"فرا بھائی سب کو چیلنج کوئی بھی میری آنکھ میں آنسو بتا دے۔" باجی ہنستے ہوئے بولی۔

"باجی تو اس انداز سے کہہ رہی ہے جیسے جس دن رو دے گی تو دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہی وجود میں آجائے گا۔" ناہید مجھ سے بولی۔

"تو باجی پوری سرخ ہو گئی، اور پھر جھینپ کر مسکرانے لگی۔ اور اس بات کے کچھ دنوں بعد میں نے بھائی جان کو سنایا، ———— بھائی جان! دنیا کا آٹھواں

عجوبہ وجود میں آگیا
باجی کی آنکھیں سرخ ہیں اور سوجی ہوئی بھی، شاید بہت دیر تک روتی رہی ہے۔
میں زبردستی بھائی جان کو باجی کے کمرے تک گھسیٹ لائی۔ اس نے ہمیں دیکھتے ہی الماری سے کوئی کتاب نکالی اور پڑھنے لگی کتاب کو چہرے کے سامنے یوں رکھا کہ ________ چہرہ ہماری نظروں سے اوجھل رہے۔

"باجی! اس دن کی بات یاد ہے؟ — آپ کا چیلنج؟" میں نے کتاب اس کے ہاتھ سے لے لی۔

"ہنسی اور آنسو پر کسی کا اختیار نہیں۔"
اور باجی کی بادام جیسی بڑی بڑی آنکھوں کے گوشوں سے دو آنسو اس کی گود میں ٹپک پڑے۔

"لیکن باجی! آپ تو کہتی تھیں....."
اس نے میری بات کاٹ دی۔

"ہاں کہتی تھی، لیکن تمہیں کیا معلوم نا جو، جانتی ہو جب حضرت آدم جنت سے نکالے گئے تو....."

"اب یہ آدم کی بچی کوئی نیا قصہ چھیڑے گی۔ یوں بھی مجھے یہ آدم اور حوا کے قصے ذرا نہیں بھاتے۔"
میں نے اکتا کر بھائی جان کو دیکھا، اور پھر باجی کو، اور پھر اٹھ کر چپکے سے چل دی۔
دروازے کے پاس جا کر میں تھوڑی دیر کے لئے، کھڑی ہو گئی،

پہلے تو باجی کی سسکیوں کی آواز پر مجھے بہت رحم آیا۔ بے چاری باجی! کتنا سسک سسک کر رو رہی تھی۔ پھر ایک دم ہنسی کی آواز آنے لگی۔ یہ باجی بھی بس پاگل ہی ہے۔

روتے روتے ہنسنے لگ گئی۔ کچھ بھی تو میری سمجھ میں نہ آیا۔ میں جلدی سے وہاں سے چلی آئی۔ اور دائلن پر ایک دھن بجانے لگی۔

بہت دنوں بعد پتہ چلا کہ فراز بھائی نے باجی کو ایک ایسی "کڑوی" بات کہی تھی کہ وہ آٹھواں عجوبہ وجود میں لانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ یہ بات باجی نے ہی مجھے بتائی۔ لیکن یہ نہ بتایا کہ وہ بات کیا تھی!

سلمیٰ بہت دنوں سے نہیں آئی تھی۔ ایک دن صبح ہی صبح سلمیٰ ٹپک پڑی۔ میں نے اسے اک دم جھنجھوڑ ڈالا۔

"بتا۔ اتنے دن سے کیوں نہیں آئی تھی؟"

"اسٹیڈی جو کرنی تھی۔" اس نے ناک سکوڑی۔

"ہونہہ، تو گویا ہم یہاں مکھیاں ہی مارتے رہتے ہیں ہے نا۔۔۔؟"

میں نے ایک چپت اس کے گلابی گال پر جڑ دی۔

"اور تمہیں کام ہی کیا ہے۔ ناولیں پڑھنا۔۔۔ دائلن پر الٹی سیدھی دھنیں بجانا یا پھر گھر بھر کے بچوں کو ستانا"

سلمیٰ نے ایسے انداز سے کہا کہ مجھے زور سے ہنسی آ گئی

"اری سلّو !"

میں سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی "ایک بات کہوں؟"

"کیا ــ ؟" وہ ہمہ تن گوش ہو گئی۔

"باجی کا چیلنج تو یاد ہے نا ؟"

"ارے بہت اچھی طرح سے"

"تو سنو ــ"

میں نے دو تین دن پہلے کی پوری روداد اسے سنادی۔ سلمیٰ بہت توجہ سے سنتی رہی اور پھر مسکرا کر بولی۔

"تو سمجھو بیڑا پار ہے"

"بیڑا پار ہے ؟ میں حیرت سے بولی "کیا بک رہی ہو بھئی۔ اپنی تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا"

"واہ، سمجھ میں کیسے نہیں آتا ؟ یعنی بھائی جان اور باجی کی شادی بالکل پکّی !"

"وہ کیسے ؟" بات ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ "اور یہ فراز بھائی جو باجی کے نام پر دھرنا دیے بیٹھے تھے، ان کا کیا بنتا ؟"

"تم پاگل ہو سلمیٰ ؟ ذرا عقل کی بات کیا کرو"

"ناجو ! تو بڑی بھولی ہے میری ناجو !" سلمیٰ نے میرے گال پر تھپکی دے کر کہا.

میرے کچھ بھی پلے نہ پڑا ، میں اکتا کر ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔

"ارے دوست خوب چوری پکڑی، کیا کر رہے ہو یہاں؟ ابھی تیری امی سے کہتی ہوں، رفو کھیل رہا ہے پڑھتا پڑھاتا خاک نہیں" رفو کو ڈرائنگ روم میں کھیلتا دیکھ کر میں نے اپنی جھنجھلاہٹ اتارنی چاہی۔

"کھیل کب رہا ہوں جی" وہ چڑچڑا کر بولا۔

"پھر کیا مچھر مار رہے ہو؟"

"یہ فراز بھائی کی فوٹو تھی نا؛ میں نے اسے نکال کر فریم میں بھائی جان اور افروز آپا کی فوٹو لگا دی ہے"

رفو تالی بجا کر بولا۔

"ارے ـــ شریر!" میں حیرت سے بولی، یہ کیا کیا تو نے؛ فراز بھائی اگر دیکھ لیں تو زندہ بھی نہ چھوڑیں گے تجھے"

"صورت تو ایسی ہے جناب کی۔ اور فوٹو لگا رکھی ہے ڈرائینگ روم میں!" رفو نے بہت ہی مضحکہ خیز شکل بنائی، میں اکرم ہنس پڑی۔

"ارے رفو! اگر بھائی جان باجی سے شادی کرلیں تو؟"

میں نے رفو کی رائے پوچھی

"واہ بھئی ـــ واہ ـــ کیا مزہ آئے گا" پھر خود ہی بولا ـــ "یہ فراز بھائی سلمیٰ سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ پھر تو باجی یقیناً بھائی جان کو مل جائے گی"

"واہ رے واہ خود غرض ـــ اپنی باجی کے لئے میری

سلی کو کنویں میں پھینک رہا ہے "۔ میں نے اسے دھمکایا۔

" فراز بھائی کنواں ـــ فراز بھائی کنواں !!"

وہ تالیاں پیٹنے لگا

میں ڈر گئی، یہ فراز بھائی تو یوں ہی اوٹ پٹانگ سے ہیں۔ اگر پتہ چل گیا کہ ناجو نے یہ خطاب دے رکھا ہے تو بوٹیاں ہی نوچ ڈالیں۔

" ارے سنوجی !" میں اسے چپ کرنے کو بولی " بھلاجی تم کس سے شادی کرو گے ؟"

" میں ـــ ؟"

وہ بہت شاعرانہ انداز سے بالوں کو جھٹکا دے کر بولا

" میں ـــ ؟"

اور پھر میرے گال پر انگلی ٹکا کر بولا " تم سے !"

" ہونہہ ـــ تم سے !!"

میں اسے چڑانے کو بولی " صورت تو دیکھو اپنی، مجھ سے شادی کرنے چلے ہیں "۔

وہ روہانسا ہو کر بولا ـ

" اتی سے کہتا ہوں، ناجو کی پٹی ستا رہی ہے "۔

میں اسے پکڑنے کو لپکی، لیکن وہ باہر بھاگ گیا۔

میں نے میز پر سے فوٹو اٹھالی اور سوچنے لگی ـ

" کاش رفو کے معصوم ہاتھوں کے صدقہ یہ دونوں ہمیشہ کے لئے ایسے ہی ایک ہو جائیں، سوچتے سوچتے میں خود ہی مسکرا پڑی !

ایک بہار کی سہانی شام کو بھائی جان آرام کرسی پر لیٹے کچھ گنگنا رہے تھے،

باجی کوئی ناول پڑھ رہی تھی، رفو اپنے آس پاس بہت سی کاپیاں کتابیں پھیلائے اسکول کا کام کر رہا تھا۔ پڑھتے پڑھتے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور بھائی جان سے بولا۔

"بھائی جان! HEART کے معنی کیا ہیں؟"

"رفو بھیا بات تو بڑے پتہ کی پوچھی ہے تم نے، لیکن مجھے خود نہیں معلوم، اپنی باجی سے پوچھ لو نا"

رفو باجی کی طرف دیکھنے لگا۔

"ڈکشنری میں کیوں نہیں دیکھ لیتے جی" باجی ناول میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہی تھی۔

"ڈکشنری دیکھنی نہیں آتی" رفو قدرے ڈر کر بولا۔

"ہائیں؟"

باجی ناول پٹخ کر بولی۔

"اتنے بڑے ہوگئے اور ابھی تک معنی دیکھنے نہیں آتے؟ لاؤ میں بتاؤں"

رفو نے ڈکشنری باجی کے ہاتھ میں تھما دی۔

"دیکھو جس لفظ کے معنی دیکھنے ہوں اس کے شروع کے تین حرف دیکھا کرو، اب جیسے یہ HEART ہے تا......"

باجی نے ایک دم بھائی جان کو دیکھا۔ اُف؟ وہ،

نگاہیں، ان میں غصہ، رحم، پیار، مسکراہٹیں، سبھی کچھ پوشیدہ تھا۔ باجی نے ڈکشنری ٹیک دی اور ناول اٹھا کر باہر نکل گئی۔ میں نے بھائی جان کو دیکھا، وہ مسکرا رہے تھے۔ میں کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔

میں نے ڈکشنری اٹھالی، اور دیکھنے لگی کہ کون سی چیز باجی کو ناراض کر سکتی ہے۔ ارے، یہ کیا؟ دل کی شناخت کے لئے چھوٹا سا جو دل بنا ہوا تھا اس میں سیاہی سے لکھا ہوا تھا، بیحد باریک باریک حرفوں میں۔

"دل کو ہے تم سے پیار کیوں؟ یہ نہ بتا سکوں گا میں۔"

"کیا ہے ناجو؟" بھائی جان نے مسکرا کر پوچھا۔

"کسی شیطان نے اس میں کچھ لکھ مارا ہے، باجی نے اسے اپنی طرف منسوب کر لیا جبھی تو چڑ کر چلی گئی۔"

میں نے ڈکشنری بھائی جان کے سامنے کر دی۔

"ناجو! میرا خیال ہے میں ہی وہ شیطان ہوں۔"

"آپ؟" میں بھونچکی رہ گئی۔ "بھائی جان!"

"کیا ہے ناجو؟"

"میں اٹک اٹک کر بولنے لگی۔

"تو..... کیا..... آپ..... ؟"

"تم نے سمجھنے میں بہت دیر کی ناجو! یہ بات تو تم سے زیادہ رفو جانتا ہے — ہے نا رفو بھیا؟"

بھائی جان رفو سے مخاطب ہو گئے۔ رفو صاحب کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی مسکرانے لگے۔ اور میرے پیٹ میں چوہے کودنے لگے کہ کب یہ بات سلمیٰ کو سنا سکوں گی۔

لیکن اس دنیا میں جو سوچو وہ کہاں ہوتا ہے۔ ہر ارمان اور ہر آرزو پوری ہو جائے تو دنیا کا نام دنیا نہ رہے۔ تمناؤں اور ارمانوں کے سسکنے اور پورا نہ ہونے کا نام ہی دراصل دنیا ہے؛

لاکھ سوچو، وہی ہوتا ہے جو قسمت کا لکھا ہوتا ہے۔ قسمت کا لکھا کبھی نہیں مٹتا۔ انسان ہر چیز پر قادر ہونے کے باوجود کتنا بےبس ہے۔

فراز بھائی اور باجی کی شادی ہو ہی گئی۔ ہمارا گھر اچھا خاصہ ویرانہ بن گیا۔ جیسے اس گھر میں کبھی قہقہے گونجے ہی نہ تھے۔

جیسے اس اجڑے باغ میں کبھی بہار آئی ہی نہ تھی۔

سلمٰی نے بی۔ اے کے بعد ایم۔ اے میں داخلہ لے لیا تھا۔ اس نے بھی آنا کم کر دیا تھا۔ کبھی کبھار آجاتی، جب کبھی وہ آتی تو ہم دونوں باجی کی باتیں کرتے۔ باجی ـــــ باجی کتنی پیاری تھی، کتنی سویٹ تھی، پھولوں کی خوشبو چاندنی کی کرنوں، سورج کی شعاعوں سے زیادہ پیاری اور حسین باجی، جو زندہ ہوتے ہوئے بھی ہم سے اتنی دور تھی کہ ہم اسے حاصل نہ کر سکے۔

میں بلی کی طرح ہر چیز کو سونگھتی پھرتی۔ کسی کام میں دل نہ لگتا۔ وائلن بجانے بیٹھتی تو وہ الٹی سیدھی تانیں نکلتیں کہ طبیعت جھلا جاتی۔

ناول، جو میری زندگی تھے، جنھیں میں امتحان کے دوران

میں بھی پڑھتی رہی، اب مجھ سے نہ پڑھے جاتے، کتابوں پر گرد کی تہیں جم گئی تھیں۔

باغوں میں پھول اب بھی کھلتے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا، جیسے ان میں وہ خوشبو نہیں، وہ روپ نہیں۔ وہ نکھار نہیں۔

رفتہ نے ڈرائینگ روم میں پھر فراز بھائی کی فوٹو لگادی تھی۔ اب اس کے معصوم قہقہے بہت کم گونجتے، باجی سب کی روح رواں تھی وہ کہاں گئی، باغوں کی بہاریں چلی گئیں۔

پھولوں کی خوشبوئیں گم ہوگئیں، زندگی کی رنگینیاں مر گئیں۔ ستاروں کی روشنی، ہواؤں کی مستی، چاند کی چاندنی بےنور ہوکر رہ گئیں،

ایسا محسوس ہوتا جیسے ہر چیز اپنی اصلیت کھو بیٹھی ہے۔ ہم سب نے جو سہانا سپنا دیکھا تھا۔ اس کی بھیانک تعبیر، ہمارے سامنے تھی،

بھائی جان دن بھر اپنے کمرے میں بند رہتے، ان کی صحت گرتی جارہی تھی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ اگر انہیں دلی خوشی نہ ملی تو ٹی بی ہو جائے گی، دو تین سال یوں ہی گزر گئے، اور بھائی جان دق کے راستے پر گامزن ہوگئے!

بھائی جان کی طبیعت بہت خراب ہو چکی تھی، زندگی کی کوئی امید باقی نہ رہ گئی تھی باجی بھائی جان کو دیکھنے آئی تو اس کی گود میں ننھا جاوید بھی تھا۔

بالکل بھائی جان جیسی آنکھوں والا ۔۔۔ ہم نے یہ بھی سنا
کہ فراز بھائی اس بات پر بہت چڑتے ہیں کہ جاوید کی آنکھوں
میں بھائی جان کیوں جھلکتے ہیں ؟
ایک دن سلمٰی بھی آئی ہوئی تھی ، ہم سب اسی ڈرائنگ
روم میں بیٹھے ہوئے تھے ، بھائی جان پلنگ پر لیٹے ہوئے
تھے ۔ ان کی پائینتی فراز بھائی بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے
ان کے بازو ہی باجی بیٹھی بھائی جان کے پیر دبا رہی تھی ۔
میں جاوید کو لئے چپ چاپ سی ایک کرسی پر بیٹھی تھی ۔
" ناجو ، باجی بیت بازی کریں گے نا ؟" ناہید بولی
مجھے دو تین سال پہلے کا وہ دن یاد آگیا ، جب ہم بیت بازی
کر رہے تھے اور باجی بے قصور پٹ گئی تھی ۔
باجی نے گہری گہری نظروں سے ناہید کو تاکا اور بولی
" گذر گئیں ۔ جو بہاریں اب ان کی یاد ہی کیا
میں نے اُن ہی افراد کی دو پارٹیاں پھر بنا دیں ، بھائی
جان بے حد کمزور آواز سے بولے ۔
پہلا شعر محفل کا سب سے حسین آدمی کہے "
سب چونک سے پڑے اور سب کی نظریں باجی پر
مرکوز ہو گئیں ، مجھے بہت تعجب ہوا جب باجی نے بغیر کسی
حیلے بہانے کے خود ہی یہ شعر پڑھ دیا ؎
اندیشۂ خزاں بھی ہے گل چیں کا خوف بھی
ہنستے ہیں پھر بھی پھول تو فطرت کا کیا علاج
اور دو موٹے موٹے آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر بھائی

جاں: پیروں پہ گر پڑے گرم گرم آنسو !! اپنے جلوؤں کی
کی: سلے د گرم آنسو ؛

بھائی جان چونک سے گئے وہ سمجھے شاید یہ سگریٹ کی گرم راکھ گر رہی ہے۔ پیر سمیٹتے ہوئے کسی قدر جھلّا کر بولے۔
"یار۔ فرازؔ! ہاتھ پرے کرکے سگریٹ کی راکھ نہیں جھٹکی جاتی، پیر کو جیسے لگ رہے ہیں"

—— ✂ ——

تختِ طاؤس

اماں نے خط لکھوانا شروع کیا۔
"لکھو بیٹی ۔۔۔۔
" پتہ نہیں ان بوڑھی آنکھوں کو کیا پتہ سہرا اور چاند ایسی دلہن دیکھنا نصیب ہو ۔۔۔ یہاں تو ہر دن موت سے قریب تر ہو رہی ہوں۔ تو ایک بار چند روز کے لئے ہی سہی آجا ۔۔۔"
اماں بولتی رہیں ۔۔۔ ان کے گلے میں رہ رہ کر پھندے سے پڑتے رہے ۔۔۔
آنسو پی پی کر، ہپا ہپا کر جب وہ خط مکمل کروا چکیں تو آس بھرے لہجہ میں بولیں ۔۔۔
" بیٹی اس کا جواب کب تک آجائے گا ۔۔ ؟"
" جواب ۔۔ ؟"
میں نے حلق میں پھڑ پھڑاتے دل کو بڑی مشکل سے قابو میں کر کے کہا
- یہی کوئی بارہ پندرہ دن میں اماں ۔۔"
" اماں ۔۔۔" میں نے چیخ چیخ کر کہنا چاہا ۔۔۔ " یہ سارا کھیل اب مجھ سے نہیں کھیلا جاتا ۔۔۔ تم جو ہر پندرہ دن کو ایک خط لکھواتی ہو وہ میری طرف سے ہوتا ہے اور جو جواب تم لکھواتی ہو وہ تمہارے بیٹے تک نہیں پہنچ سکتا، کیونکہ اماں آج تک کوئی ہرکارہ ایسا پیدا نہیں ہوا جو مرنے والوں تک خطوں

کو پہنچا سکے ــــ میرا مسرت لوٹو اماں ــــ تمہارا بیٹا، تمہارا شہزادہ ــــ وہ تمہاری زندگی کا اکلوتا اور آخری سہارا جنگ میں کام آ چکا ہے ــــ تم اسے خط لکھواتی رہو گی، اس کی دلہن کے بے جوڑے سی سی کر رکھتی رہو گی، لیکن وہ اس جگہ جا چکا ہے اماں، جہاں تمہارے آنسو اور آہیں بھی نہیں پہنچ سکتیں ۔»

لیکن میں نے اماں کے کمزور، ناتواں اور دکھوں سے بوجھل جھکے ہوئے وجود کو دیکھا اور اپنے پہلو میں لٹتے دل کو مسوس کر، ذرا بشاشت سے کہا۔

"اماں خطوں میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے، تم اتنی بے کل کیوں ہو جاتی ہو ــــ اس کا دنیا میں سوائے تمہارے کوئی ہے ــــ ؟

پھر وہ تمہیں یاد نہ کرے گا تو اور کسے کرے گا ـــ؟"

"اسے نہیں بیٹیا ــــ وہ جھلائے ہوئے ــــ پیار سے بھرپور لہجہ میں بولیں ــــ "ان آج کل کے چھوکروں کا کوئی ٹھیک نہیں ہے، یار یار دوستوں میں مل بیٹھے اور یہ بھی بھول گئے کہ کوئی ماں بھی ہے ــــ"

"ارے نہیں اماں تم غلط سوچتی ہو ــــ وہ سف ایسا نہیں ہو سکتا ــــ"

"اب بیٹیا تو اسی کی طرف سے نہیں بولے گی تو کون بولے گا ویسے تو ہمیشہ تو خود اس سے جھگڑتی رہی لیکن جاں میں نے کچھ کہا تجھے او بڑا کر اس پر پیار آیا۔ ہاں بیٹیا یہ بھی یاد سے لکھ دینا کہ منہ دکھائی میں تو اپنی دلہن کو انگوٹھی پہنائے

گایا کلائی پر گھڑی باندھے گا ـــ مجھے تو ایک ایک چیز، جوڑنی ہے، وقت پر ایک دم سے سوجھتا بھی تو نہیں۔ یاد سے پوچھوا لینا بیٹی ـــ "

"ہاں اماں ـــ" میں نے سر جھکا لیا ـــ "اور کچھ کہنا ہے اماں۔؟"

میں نے ٹوٹتے دل سے پوچھا۔

"نا بٹیا ـــ اب کیا لکھنا ہے ـــ اور جو پوچھو تو اتنا لکھوانا ہے کہ آسمان جتنا بڑا کاغذ بھی کافی نہ ہو۔ یہ ماں کا دل ہے نا بٹیا ـــ اس کے پیار اور ممتا کا کوئی اور چھور نہیں ہے ـــ"

میں اٹھنے لگی تو اچانک جیسے انہیں پھر کچھ یاد آگیا ـــ "بٹیا یہ بھی پوچھ لینا کہ آج کل تو نیا زمانہ ہے، نئے نئے فیشن نکلے ہیں ـــ ہمارے زمانے میں تو سہاگ کا سرخ جوڑا چڑھتا تھا، اب تو گلابی، نارنجی اور سفید تک چڑھنے لگے ہیں، اپنی پسند کا رنگ بتلا دے ـــ"

وہ ان دیکھی دلہن ـــ وہ پھولوں بھری سہاگن جو وقت سے پہلے ہی بیوہ ہوگئی۔ اماں اسے کون سا رنگ سجے گا نہ دولہا ہے نہ دلہن ـــ

اماں یہ بوجھ اٹھاتے اٹھاتے اس راز کو پالتے پالتے مجھے دق ہو جائے گی ـــ مگر میں نے خود کو سنبھال کر، کہا ـــ!

اطمینان رکھو اماں میں سب لکھ دوں گی ـــ" اور

اپنے کمرے میں آکر میں سسک پڑی۔

اماں بے چاری کے نصیب بھی کیا نصیب تھے۔

بچپن سے غریبی میں گذر بسر ہوئی ـــــ جوانی آنے پر ماں باپ نے اپنی ہی حیثیت دیکھ کر شادی کر دی ـــــ شادی کے ایک ہی سال بعد ایک معمولی سی بیماری میں میاں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

یوسف باپ کی موت کے دو ماہ بعد دنیا میں آیا۔ جوان بیوہ کا اکلوتا سہارا ـــــ غریبی کے ہاتھوں نوکری ڈھونڈتی ڈھونڈتی جب وہ ہمارے در پر پہنچی ہیں، اس وقت ہمارے یہاں صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔

کئی ننھی ننھی جانوں کو چھوڑ کر میری امی موت کو اپنا چکی تھیں۔ بڑے بچے تو کیسے بھی پل ہی جاتے ہیں مگر ایسا بچہ جس نے ماں کے سینے کے گرم اور نرم زندگی بخش لمس کو محسوس تک نہ کیا ہو، جس نے ابھی دنیا کو آنکھ کھول کر دیکھا تک نہ ہو، ایک دم بھری بھری دنیا میں تنہا رہ جائے تو ـــــ یہ کوئی اس دل سے پوچھے جس کے سر اتنے سارے بچوں کی ذمہ داری آپڑی ہو۔

زینت بی کو فوراً ہی ملازمت پر لے لیا گیا کیونکہ ان کی اپنی گود میں خود ایک چھوٹا سا دودھ پیتا بچہ موجود تھا۔ چھوٹے بھلے سے دوسروں کے ہوں، ان کو ایک ایسی عورت ہی پال سکتی ہے۔ جس کے اپنے دل کو ماں تا کی کلپ لگی ہوئی ہو ـــــ !

مگر زینت بی نے تو کچھ زیادہ ہی کر دکھایا، اپنے نسبتاً بڑے بیٹے کو انہوں نے اوپر کے دودھ پر لگادیا اور اپنے نئے مالکوں کی بچی کو یعنی مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔

راتوں کی نیندیں اور دن کا چین حرام کر کے اپنے جسم کا خون پلا پلا کر انہوں نے گھر والوں سے ایک التجا کی۔

" غلطیاں انسان سے ہی ہوتی ہیں، میں بھی انسان ہوں خطاؤں کی پوٹ ؛ مگر میرے کسی قصور پر مجھے اس گھر سے نہ نکالا جائے۔ اس بچی سے جدا نہ کیا جائے، اس کے بغیر میں جی نہ سکوں گی

میں نے اس کے لئے نو مہینے کا وہ کرب نہیں جھیلا، جسے جھیل کر ایک ماں جنت کی خالق بنتی ہے۔ مگر میں نے اسے اپنی جوانی نذر کی ہے جو ایک عورت کا سب سے خوبصورت سرمایہ ہوتی ہے۔۔

اور یہ حقیقت تھی کہ میری خاطر راتوں کو جاگ جاگ کر وقت بے وقت کی روں روں پر اپنا چین لٹا کر انہوں نے اپنے خوبصورت سیاہ بالوں کو قبل از وقت اُجالے عطا کئے تھے اور وہ جو سارے گھر کی محض زینت ہی تھی ان دو ننھے منے ہونٹوں کی جنبش نے پہلی بار بولنا سیکھا تو اماں ہی سیکھا۔ شروع سے اخیر تک صرف اماں ہی اماں تھیں۔

اور وہی ایک ہیں اماں جو خوبصورت خطاب کی مستحق ہو سکتی ہے۔ جو کسی معصوم کی تکلیف پر آنکھیں نم کر کے اور یہاں تو ساری زندگی بھر کے لئے، میری خاطر آنسوؤں کا ٹھیکہ لے لیا تھا۔

میں جب ذرا بڑی ہوئی اور ایسی چاہنے والی ماں کا اصل روپ دیکھا اور جانا تو میرا دل درد اور کرب سے بھر گیا۔ ان کی وہ چھوٹی اور اندھیاری کوٹھری جس کی چارپائی پر سن کاٹ صابن سے دھلی چادر۔ غریبانہ مگر صاف ستھرا بستر۔ میں نے پہلی بار اپنے حسابوں ان سے بڑا بھاری وعدہ کیا تھا۔

"اماں جب میں بڑی ہو جاؤں گی تو تمہیں چاندی کے تخت پر بٹھاؤں گی خوب نرم نرم ریشمی روئی بھرا گدا اس پر ریشمی چادر۔۔۔

ساری دنیا آئے گی اور دیکھے گی اور حیرت سے پوچھے گی بھئی یہ چاندی کے اس شاندار تخت پر کون بیٹھا ہے"۔ اور میں بڑے فخر سے سب کو بتاؤں گی۔۔۔۔ "یہ میری آماں ہیں۔۔۔ !"

اماں بڑے پیار سے ہنس پڑی تھیں اور مسکرا کر بولی تھیں۔۔۔ !

"اور یہ یوسف میرے لئے کچھ نہ کرے گا۔۔۔ ؟"

"کرے گا کیسے نہیں وہ بڑا ہو کر تمہارے لئے ایک چاند ایسی بہو لائے گا۔ پھر اپنے گھر میں خوب سارے ننھے بچے ہوں گے، اور مارے شور کے تم ان کے پیچھے بولھلا کر بھاگو گی۔۔۔"

یہ خواب ایک ساتھ میں نے اور آماں نے دیکھا تھا۔ مگر خواب کی تعبیر یہ تھی کہ اماں کا جوان بیٹا جنگ میں مارا جا چکا تھا۔ اور وہ آس بھری نامراد ماں ہر پندرہ دن

میں اپنے جگر گوشے کو ایک خط لکھواتی تھی کہ میرے اعضاء جھک گئے ہیں۔ سر پر سورج سایہ فگن ہے، دکھوں اور غموں نے دقت سے پہلے ہی الوداع کہہ دیا ہے، ایسے میں آنکھوں کی ایک ہی تمنا ہے کہ تجھے دولہا بنا دیکھیں۔"

اماں مجھے یوسف سے کسی بھی طرح کم نہ چاہتی، ورنہ یوسف کی جدائی شاید انہیں مار ہی ڈالتی ۔ انہیں خود بھی اس بات کا احساس تھا کہ وہ مجھے بے پناہ چاہتی ہیں اور میں تو خدا کے بعد انہی کے سہارے زندہ رہ رہی تھی۔

ایسے میں یہ میرے لئے کیسے کرب کی بات تھی کہ پچھلے کئی سال سے اس راز کو پالے جا رہی تھی۔

لگتا تھا دل میں پھوڑا ہو جائے گا اور یہ بوجھ کسی دن یوں بڑھے گا کہ میرا دل پھٹ جائے گا۔

میں اس دن کے بارے میں سوچتی کہ جب ایک غمناک سے دن ایک خط آیا تھا ۔ جس نے ہمیں یہ اطلاع دی تھی کہ یوسف میدان جنگ میں کام آگیا۔ اگر میں ضبط اور حوصلے سے کام لیکر اسی دن اماں کو بتا دیتی کہ اماں تم نے جو ایک پودا لگایا تھا وہ بھری جوانی اور بھری بہار میں منہ موڑ گیا ہے۔ اور اب زندگی بھر کے لئے تمہاری آنکھوں میں آنسو ہیں، تو شاید وہ جو دکھ سہتے سہتے پتھر بن چکی تھیں، یہ وار بھی سہہ جاتیں۔

لیکن میں خود ہی یہ قدم نہ اٹھا سکی، اور میں نے ایک بڑے جوکھم کا فیصلہ کر لیا۔

"میں زندگی بھر۔۔ اماں کی زندگی بھر اس راز کو باقی رہوں گی کہ یوسف مر چکا ہے۔۔"

یوسف ہر ماہ اپنی تنخواہ میں سے اماں کو ۲۵ روپے بھی بھجواتا تھا۔

یہ مرحلہ میرے لئے سب سے کٹھن تھا۔ میں پچیس روپے ماہانہ آخر کہاں سے لاؤں گی ۔۔۔ بہرحال یہ منزل بھی طے کرنی ہی تھی۔

میں اماں کی طرف سے خط لکھتی ۔۔۔ ان بیچاری کو تو لکھنا پڑھنا آتا ہی نہ تھا۔ وہ مجھ سے کہتی، میں لکھتی جاتی پھر یوسف کی طرف سے بھی میں خود ہی جواب لکھ کر پوسٹ کر دیتی۔

یوسف کی زندگی میں مخصوص فوجی نمبروں والے خط آتے تھے۔ ممکن ہے اماں تاڑ جائیں کہ اب خط ویسے نہیں ہوتے۔ تو اب میں خط کاپی میں رکھ کر انہیں سنایا کرتی تھی۔۔۔ ہر مہینے بڑے جتن سے منی آرڈر کرتی اور اماں انگوٹھا لگا کر وہ روپے وصول کر لیتیں اور خوش ہو ہو کر فرمائش کیا کرتیں۔۔!

"اے بیٹی ۔۔ اب کی بار چاندی کی پازیب خریدلینگے دلہن سارے میں چھم چھم کرتی گھومے گی تو گھر میں بڑی رونق لگے گی۔۔۔"

"بٹیا ۔۔ اب کے ناک کی نتھ بنوائیں گے۔ نتھ نہ ہو تو دلہن کے نور نہیں لگتا ۔۔۔۔ نور نہیں اترتا۔"

"بیٹی اس ماہ کنگن خریدیں ۔۔؟ کنگن نہ کھنکیں

تو......

میں سوچتی ـــــ میری شادی ہو جائے گی تو کون اس راز کو پائے گا ـــــ ؟

شادی تو بہرحال ہونے ہی والی تھی ـــــ پھر سوچتی اماں کو اپنے ساتھ ہی اپنی سسرال لے کر کیوں نہ چلی جاؤں ـــــ ؟

لیکن ہم کچھ اور سوچتے ہیں وقت کچھ اور کرتا ہے۔ میری شادی کی بات ابھی پکی ہوئی ہی تھی کہ اماں کو نمونیہ ہوگیا اور آخری بلاوا آگیا ـــــ

شاید مرنے والوں کو احساس ہو جاتا ہے کہ یہ ہماری آخری گھڑی ہے ـــــ

انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا اور رک رک کر بڑی مشکل سے بولیں ـ

" بیٹا تو جنتی ہے ـــــ کچھ ایسی بیٹیاں صدیوں میں پیدا ہوتی تھیں ـــــ تو نے میرے لئے وہ کیا جو پیٹ کی بیٹی بھی نہ کرتی ـــــ "

" اماں میں تمہارے پیٹ ہی کی بیٹی ہوں ـــــ تم نے مجھے زندگی دی تھی اماں ـــــ ، اپنا خون پلایا تھا۔ اور اولاد کسے کہتے ہیں اماں ـــــ ؟ "

" نہیں بیٹا ـــــ پیٹ کی اولاد بھی اتنا نہیں کر سکتی جو تو نے کیا ـــــ بیٹا "

وہ کراہ کر بڑے آنسو بھرے لہجے میں بہت

رک رک کر بول رہی تھیں۔

" بٹیا جس دن یوسف کی موت کا خط آیا، میں ساتھ والے کمرے میں صفائی کر رہی تھی اور تو سمجھی کہ میں باورچی خانے میں ہوں ـــ بڑے ماموں کو تو نے خط سنایا اور کہا ـــ

" ماموں میاں، اماں کو یہ بات معلوم نہیں ہونی چاہیئے۔ ورنہ وہ رو رو کر جان سے چلی جائیں گی.... اماں ـــ "

میں چیخی ـــ مگر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا۔

" میں نے سوچا جب میری بیٹی میری جان مجھے دکھی نہیں دیکھنا چاہتی تو مجھے بھی اس راز کو پالنا ہی ہوگا ـــ اور میں نے بھی اپنی وہی پرانی روش قائم رکھی ـــ مرنے والا تو جان سے گیا، مگر تیرے لئے میرا دل کیسے کیسے ٹوٹتا تھا میری بیٹی ـــ

لیکن اگر میں کہہ دیتی کہ مجھے سب معلوم ہے مجھے پتہ ہے کہ یوسف مرگیا، تو تو مجھے غمگین نہ دیکھ پاتی اور میں تیرے آنسو نہ دیکھ پاتی...... "

میں پتھر کی مورت بنی سن رہی تھی اور وہ رک رک کر کہے جا رہی تھیں ـــ

" میں نے وہ سب زیور دراصل تیرے لئے خرید رکھے ہیں بیٹی ـــ

پیسہ تو اُڑ ہی جاتا ہے بیٹی — اس سے زیادہ تیز رفتار شے میں نے آج تک نہیں دیکھی، دبے قدموں آنے والا تیزی سے جانے والا — اسی کے کارن میرا بیٹا مجھ سے چھٹا —۔

سوچتی تھی میری بٹیا جو اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر یہ روپیہ مجھے بھجوا رہی ہے اسے فضول نہ گنواؤں، اب میرا آخری وقت ہے بیٹی — تیرے سامنے تیری زندگی ہے، خدا کیسے میری دعا پوری نہ کرے گا۔ وہ تجھے ہر خوشی سے نوازے گا بیٹی — تیری ایک آرزو تھی بیٹی کہ مجھے چاندی کے تخت پر بٹھائے ۔ تو نے تو مجھے اس تختِ طاؤس پر بٹھایا ہے بیٹی جسے دل کہتے ہیں — میں اس دل کی عظمت کے آگے اپنا سر جھکاتی ہوں بٹیا.... اور سر جھکنے کی کوشش میں اماں جو آگے کو ہونے لگیں تو لڑکھڑا کر نیچے کو جا پڑیں — پھر وہ کبھی نہ اٹھ سکیں۔

میں رونا چاہتی ہوں تو مجھے اماں کی وہ بات یاد آتی ہے کہ —" میں تیری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتی تھی اسی لئے اس راز کو پالے رہی —"، میں آنسو ضبط کرنا چاہتی ہوں۔ کر بھی لیتی ہوں ۔ لیکن روتے ہوئے دل کو کیسے منع کروں — ؟ کیسے سمجھاؤں — ؟

پیٹ

سہاگ رات کس قدر گرم تھی!
حالانکہ اس کی شادی جاڑوں کے ٹھنڈے ٹھنڈے برف سے دنوں میں ہوئی تھی۔
سرخ سرخ کپڑوں میں لپٹی اس کی دلہن۔ جیسے انگیٹھی، دہک رہی ہو ـــــ لیکن انگیٹھی تو کبھی نہ کبھی سرد پڑ جاتی ہے ـــــ اس کی دلہن تو سدا بہار آگ تھی۔
دوستوں کا سکھایا پڑھایا قطعاً کام نہ آیا، مدتوں تو وہ یونہی دلہن کو یک ٹک دیکھے گیا، ساری گھبراہٹ یہ تھی کہ حُسن کی اس مورتی کو دیکھتے دیکھتے ہی رات صبح سے نہ بدل جائے، لیکن دیکھنے سے جی بھرتا تو وہ ہاتھ پاؤں ہلاتا ـــــ
یہاں تو مرنے والے کی طرح جسم کا سارا دم دو آنکھوں میں آ کر اٹک گیا تھا۔
آنکھوں کا دل تو بھرنے سے رہا ــــ اس نے ایک ترکیب سوچی۔ "آنکھیں بند کر لوں ــــ؟"
وہ مسکرایا پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور نرم نرم گڑیا کو بانہوں میں بھر لیا۔
وہ پاگلوں کی طرح بکھر رہا تھا۔
"میں تمہاری دھجی دھجی اڑا دوں گا ـــــ"

ہلکی ہلکی کسمساہٹ اور شرم کے ساتھ دلہن "نہیں نہیں" کہتی جا رہی تھی، لیکن انداز بیاں میں بھی ایک سپردگی تھی۔

"پلیز — پلیز...."

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ، اپنا سراپا چھپا چھپا لیتی لیکن وہ اپنی طاقت کے بل پر اس کے ہاتھوں کے پیالے میں سے چہرے کا پھول اپنے ہونٹوں کے قریب لے آتا۔

وہ ہی لجاجت —

پلیز — پلیز....

پلیز نہ ولیز — " وہ وحشی ہوا جا رہا تھا، "پھر تم اتنی حسین کیوں ہوئیں —؟"

اور وہ سہاگ رات والی بے قراری آج چھ سال گزر نے پر بھی اسی طرح قائم تھی اور وہ دیوانہ کر دینے والا حسن دو بچوں کو جنم دینے پر آج بھی اسی طرح قائم تھا۔

وہ دونوں جب کبھی گھومنے پھرنے جاتے محمود ہمیشہ ساتھ میں ایک تیز دھار والا چاقو اپنے ساتھ لئے رہتا۔ پہلے پہل اس نے گھبرا کر پوچھا تھا۔

"یہ..... یہ اتنا بڑا اور تیز چاقو — پرے پھینک دیجئے — مجھے اس سے ڈر لگتا ہے، آخر اس کا مصرف کیا ہے —؟"

"مصرف —؟"

وہ خوشدلی سے ہنسا تھا ـــــ "ارے بابا میں کوئی ایسا غنڈہ نہیں ہوں جو جا قو جھرے اپنے ساتھ لئے، گھومتا رہوں لیکن جانِ من تم اس قدر حسین ہو اور اتنی عزیز ہو کہ میں برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی اور تمہیں نظر بھر کے بھی دیکھ لے"

"وہ ہنسی ـــ ارے واہ ـــ سڑک پر بغیر پردے کے چلیں گے تو کسی نہ کسی کی نگاہ تو پڑے گی ہی ـــ"

"نہیں ــ" وہ بری طرح چیخا تھا ـــ پھر وہ اپنے لہجہ کی تندی پر ذرا شرمندہ ہو کر بولا ـــ

"معاف کرنا میری چاند ـــ میری ثریا ـــ اس معاملے میں میں بڑا ہی قدامت پرست اور حاسد ہوں جو تمہیں بری نظر سے دیکھے گا وہ سیدھا اللہ میاں کے پاس پہنچ جائے گا....."

یہ سارا محبت کا کھیل تھا، لیکن ثریا نے سہم کر سوچا۔ "اللہ نہ کرے کہ یہ تو کبھی میں بھٹکوں۔"

سہاگ رات کا نشہ ایسا نشہ تھا جو ایک بار چڑھا تو پھر کبھی اترا ہی نہیں۔ لڑکی دلہن بنتی ہے ـــ دلہن سے ماں ـــ ماں سے عورت ـــ ماں بن کر کہنے والے کہتے ہیں عورت اپنا دہ چارم اور جادو کھو دیتی ہے جو مرد کو باندھ کر رکھتا ہے۔

جسم ڈھل جاتا ہے تو مرد کی محبت بھی چاند کی طرح ڈھل جاتی ہے۔ لیکن ثریا تو جیسے اتنے سارے

دنوں سے کسی برف خانے میں بند رہی تھی۔ وہی کسا ہوا جسم ـــــ وہی دلبری کی ادائیں ـــــ وہی بیکادینے والی معصومیت ـــــ وہی گمراہ کردینے والی شریر آنکھیں ـــــ

سنیچر کی رات اپنے دامن میں دیوانگی کے جراثیم لے کر آتی ـــــ

"آج میں بادشاہ ہوں ـــــ" محمود فخر سے سینہ پھلا کر کہتا ـــــ "جانتی ہو کہ ـــــ آج سنیچر ہے۔ آج ہماری سہاگ رات ہے کل اتوار ہے۔ جی بھر کر جاگیں گے اور کل جی بھر کر سوئیں گے۔"

دل میں خوش ہو کر، بظاہر شرما کر ثریا بولتی ـــــ اور تو یہ دو دو رقیب روسیاہ ہیں ـــــ؟" اس کا اشارہ، بچوں کی طرف ہوتا۔

"افیون کھلا کر سُلا دیں گے سالوں کو ـــــ" وہ خوش دلی سے ہنستا ثریا ہنس دیتی ـــــ ہنسے ہی جاتی اور رات جب چپکے سے اپنا آنچل پھیلاتی محمود نئے، دولہوں کی سی بے قراری سے بچوں کے سو جانے کا انتظار کرتا اور جیسے ہی بچے سوتے وہ جھپٹ کر ثریا کو گود میں اٹھا کر بھاگ جاتا۔

دوسرے کمرے میں لا کر وہ اسے دھیرے سے صوفہ پر لٹا دیتا۔ اور جاڑوں کے ٹھنڈے ٹھنڈے برف جیسے دن گرمیوں کی طرح تپنے لگتے

"کہو تم میری ہو ـــ"

اس کی بے وقوفیوں سے تنگ آکر وہ بچوں کی طرح جواب دیئے جاتی ـــ

"ہاں بابا آپ کی ہوں ـــ"

"ہمیشہ میری رہو گی نا ـــ ؟ ہر حال میں ـــ !"

"سو فیصد ـــ"

"کبھی کسی کی طرف جھکو گی تو نہیں نا ـــ ؟"

وہ ہنس دیتی ـــ "میں بھی سدا تمہارا ہی رہوں گا ـــ"

ـ اور یہ حقیقت تھی کہ ہر حال میں وہ اسی کی تھی، اب جبکہ چند مہینوں سے اس کی نوکری چھوٹ گئی تھی اور دانے دانے کی محتاج ہوگئی تھی۔ گھر کا سامان بکنے کی نوبت آگئی تھی وہ اسی کی تھی ـــ

بے خدھا بر اور شاکر نہ ہونٹوں پر فریاد نہ چہرے پر شکایت ـــ

کبھی کبھار وہ خود کو گنہ گار محسوس کرتا۔ جب نوکری پرمننٹ نہیں تھی تو مجھے شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ آخر ـ کسی معصوم کی آرزوؤں کا گلا گھونٹنے کا اختیار مجھے کس نے دیا تھا ـــ ؟

لیکن یہ بھی کسے معلوم تھا کہ ادھر بیچ میں یوں نوکری چھٹ جائے گی اور وہ ایم اے کی ڈگری لٹکاتا یوں ہی ٹھکے کھاتا پھرے گا ـــ پھر بھی وہ اس کی تھی ـ

سنیچر کی ہر رات وہ بادشاہ تھا ـــــ ویسے تو بیکاری نے ہر دن کو اتوار بنا دیا تھا ـــــ لیکن سنیچر کی رات "سہاگ رات" منانے کی جو عادت اس کی سرشت میں پڑ گئی تھی وہ، ہر حال، برقرار تھی۔

مرد غریب ہو جائے تو کچھ وہی سا ہو جاتا ہے ور نہ کوئی بات نہ تھی جو محمود یہ سوچنے لگتا کہ ثریا بدل سی گئی ہے ـــــ ـــــ اور یہ صرف پندرہ دنوں سے وہ محسوس کر رہا تھا۔

پچھلے سنیچر کو جب ـــــ اس نے اپنی چاند جیسی چمکیلی اور معری کی ڈلی جیسی میٹھی دلہن کو بچھونے میں بھرا تو جذبات سے ٹوٹ کر بولا۔

"خدا کی قسم کیا عورت ہو ـــــ نامرد بانہ بیٹھ جائے تو مرد ہو جائے ر ـــــ"

لیکن استنے بھر پور، تعریف سے بھر پور جملے کا ثریا نے کوئی نوٹس ہی نہ لیا ـــــ چپ چاپ لیٹی رہی۔

ورنہ عورت ـــــ اور بچوں والی عورت، جسے اپنے شباب کے بکھر جانے کا ذرا زیادہ ہی احساس ہوتا ہے تھوڑی سی تعریف سن کر کھل ضرور جاتی ہے، مگر وہ تو مسکرائی تک نہیں۔

اس نے پے در پے اس کے کئی پیار لے ڈالے، تب بھی وہ جیسے اپنے ہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔

"تم کچھ سے کچھ کترار ہی ہو ثریا ـــــ ؟" اچانک وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"اب بکنے کے لائق کوئی سامان نہیں رہا، زیور تو سب جا چکا اور راشن بھی ختم ہو گیا۔"
لیکن اس وقت ان سب پھیکی باتوں کا کیا مقام ہے۔ وہ جھلا گیا
یہ عجیب بات ہے کہ مرد جب "سہاگ رات" منانے کے موڈ میں ہو تو پھر اسے کوئی پریشانی یاد نہیں رہتی ـــــ اس نے پھر سے بساط بچھانی چاہی، اس کے گلے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا
"سب ٹھیک ہو جائے گا ــــ آؤ میرے گلے لگ جاؤ ــــ"
لیکن اس نے محسوس کیا کہ اس کی دلہن کچھ کترا رہی ہے ـــ چھ سالوں سے جو انداز خود سپردگی اس میں رچا ہوا تھا، وہ کہیں کھو سا گیا ہے۔ وہ کچھ ڈری ڈری سی لگ رہی ہے۔ شاید حالات سے !!
اس نے بہت منانا چاہا لیکن وہ بیٹھ کر سسکتی ہی رہی وہ بھوکا ہی سو گیا ـــــ نہ جسم کی بھوک مٹی نہ پیٹ کی ـــــ۔

دوسرے دن وہ حسب معمول بشاش تھا، اتنی پیاری بیوی سے وہ ناراض رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ باہر جانے لگا تو شرم یا لجاجت آمیز لہجہ میں بولی۔
"شام کو مجھے کھانے لے چلئے گا؟"
وہ اتنے پیار سے فرمائش کر رہی تھی کہ وہ یہ بھی نہ کہہ

سکاکہ "میری جیب میں ایک پیسہ تک نہیں ہے تمہیں باہر جانے کے لئے ایک روپیہ تو ہو ـــــ" بہر حال اس کا دل تھوڑا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ بے مدیار سے بولا۔
"میری جان فرمائش کرے اور میں نا کہوں و شام کو تیار رہنا بچوں کو بھی لے لینا ـــ"

شام کو وہ گھر آیا تو سب تیار تھے۔ نمود نے بڑے اچنبھے سے دیکھا کہ ثریا نے آج اپنی شادی والا سرخ، سرخ جوڑا پہن رکھا ہے۔ اتنے سالوں میں کوئی دوسری عورت ہوتی تو جانے کتنی موٹی ہو جاتی۔ لیکن چھ سالوں کے بعد بھی ثریا کے وہ جوڑا جوں کا توں برابر تھا ـــــ اس نے تعریفی انداز سے بیوی کو دیکھا اور چاقو کو ٹٹولا ـــــ
"چاقو رکھ لیا ہے نا ـــ؟"
ثریا سنجیدگی سے بولی۔
"ایسی بیوی ساتھ ہو تو چاقو رکھنا ہی پڑتا ہے۔"
وہ ہنسا ـــــ
"ایسی بیوی کے لئے چاقو رکھنا ہی پڑتا ہے۔"
وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑائی ـــــ پھر، زور سے بولی۔
"مگر چلیں گے کہاں ـــ؟ بس کے کرائے بھر کے پیسے بھی تو نہیں ہیں ـــ۔"
اس نے جیبیں تھپ تھپائیں ـــ "ہاں پیسہ

تو ایک بھی نہیں ہے۔"

"تو پھر یوں کریں کہ سمندر کے کنارے چلتے ہیں پیدل پیدل نکل جائیں گے قریب ہی تو ہے۔"

"ہاں آئیڈیا برا نہیں ـــ جگہ اچھی ہے ـــ"

"خودکشی کے لئے تو زیادہ ہی اچھی ہے ـــ" وہ اپنی دھن میں پتہ نہیں کیا کہہ گئی ـــ

جب وہ چاروں سمندر کی ٹھنڈی ٹھنڈی گیلی گیلی ریت پر بیٹھ گئے تو اچانک محمود نے ثریا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اب مجھے تم سچ سچ بتا دو کہ تمہارے دل میں کیا ہے، یہ تمہارا اکھڑا رہنا، پھر گھر سے چلتے وقت چاقو کے بارے میں پوچھنا ـــ اور پھر یہ کہنا کہ سمندر خودکشی کے لئے اچھی جگہ ہے...... تم چاہتی کیا ہو؟ جان من مجھے سب کچھ بتا دو ـــ دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا......

ثریا نے سکون کے ساتھ سانس لیا۔

"میں خود اسی لئے آپ کو یہاں لائی ہوں ـــ تاکہ میں خودکشی کر سکوں ـــ یا آپ مجھے چاقو مار کر ہلاک کر دیں......"

وہ آنسوؤں پہ قابو پانا چاہ رہی تھی اس لئے رک رک کر بول رہی تھی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ جیسے شوہر کے ساتھ ایسی بھی اپنی بیوی کو اسی طرح چاہتا ہے جیسے پہلی شب ہو...."

"لیکن تم کچھ بتاؤ گی بھی...... محمود انتہا سے زیادہ

بے چین نظر آ رہا تھا۔

"میں ..... " وہ سسکی ..... "میں ابھی سب کچھ بتاتی ہوں ..... اور وہ اس طرح سب کچھ کہتی گئی، جیسے چابی بھر دینے پر ریکارڈ بج اٹھتا ہے۔

"آج سے پندرہ دنوں پہلے کی بات ہے۔ میں نہا کر بالکنی میں بال سکھانے کھڑی تھی، سہ پہر کا وقت تھا، بھوکے بچوں کو میں نے ذرا سی شکر پانی میں گھول کر دودھ کے بہانے پلا کر سلا دیا تھا ـــــ میں مستقبل کے بارے میں سوچ رہی تھی جب ہمارے پاس بہت سے پیسے ہوں گے ـــ بنگلہ ہوگا ـــ کار ہوگی ـــ فون فریج۔ بہت سے نوکر ـــ کسی بات کے لئے ترسنا نہیں پڑے گا۔ اور ہونٹوں پر خوشی کے نغمے ہوں ..... اور شاید انہیں خوش آئند خوابوں نے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی اپنے خوابوں سے میں اس وقت جاگی۔ جب نیچے کار میں سے ایک خوش پوش نوجوان اتر کر سیدھا اوپر ہی چلا آیا ـــ میرا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے کمرے میں لے گیا۔ اور ایک ایک کر کے میرے سارے کپڑے اتارتا گیا ـــ بیچ بیچ میں وہ کہتا رہا۔

ننگی رہو ـــــ کپڑے تو بدصورت عورتیں اپنی، بدصورتی چھپانے کو پہنتی ہیں ..... تم جیسی حسین عورتوں کو تو ننگا ہی رہنا چاہیے۔

مجھے پتہ تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ کیونکہ میں کوئی بچہ نہیں تھی۔ ایک بیوی تھی جس نے چھ سال کی

کئی خوبصورت راتیں اس انداز سے گزاری تھیں۔ لیکن اس وقت میرے ذہن میں صرف وہ بچے تھے جو شکر ملا پانی پی کر سونے ہوئے تھے جو جاگ کر مجھ سے روٹی کا، مطالبہ کرنے والے تھے۔

جن کا باپ شام کو نوکری کی ناکام تلاش کے بعد بھوکا ماندہ گھر واپس آنے والا تھا۔ گھر خود مالک مکان کے تقاضوں سے ہاتھ سے جانے ہی والا تھا۔

ایسے میں میں نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ مجھے رونا تو اس وقت آیا جب وہ دس دس کے نہیں..... سو سو کے دو نوٹ میرے ہاتھوں میں یہ کہہ کر تھما گیا کہ۔

ڈارلنگ تم جیسی حسین اور پیاری گڑیا کے لئے یہ دو سو روپے کوئی حقیقت نہیں رکھتے تم اسی طرح مسکراتی سیدھی بالکنی میں کھڑی رہو تو میں قسم خدا کی روز روز نہ پھیرے لگاؤں.....

پھر جب وہ چلا گیا تو میں راشن کارڈ لے کر سیدھی راشن کی دوکان پر پہنچی۔ دال چاول، آٹا گوشت سبھی چیز آ گئی۔ میں نے سارے دن کے پیٹ کا دوزخ بھر دیا۔ لیکن خود ایک ایسے دوزخ میں جلنے کے لئے زندہ رہ گئی جس کا حال سوائے میرے کوئی نہیں جان سکتا تھا۔ میں نے یہ سارے دن کیسے گزارے ہیں؟

اس کا دکھ میں کیا کہوں؟ آپ کے ڈر سے پڑوسن

سے قرض کا ڈھونگ رچایا اور باقی کے روپے ابھی تک صندوق میں پڑے ہیں....."

ریکارڈ ختم ہو چکا تھا — بڑی دیر خاموشی چھائی رہی —

دونوں بچے کھیلتے کھیلتے دور نکل گئے تھے۔ پھر ثریا نے خاموشی توڑی۔

"اسی لئے میں نے چاقو کے بارے میں پوچھا تھا آپ جو اتنے حساس اتنے حاسد تھے کہ ہر رات مجھ سے پوچھتے تھے کہ

"تم میری ہی رہو گی نا؟"

وہ شوہر یہ کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ اسکی بیوی نے کسی اور کا پہلو گرمایا ہو.....

اور ...

سمندر پر آنے کے لئے میں نے آپ کو یوں اکسایا تھا کہ ....

ممکن ہے آپ کو دو بچوں کی ماں پر رحم آجائے اور آپ ہاتھ چلا سکیں تو میں سمندر میں کود کر اپنی زندگی ختم کر لوں.......

محمود منہ پھیرے بیٹھا سب کچھ سن رہا تھا۔ ثریا خاموش ہوئی تو بڑی دیر کے بعد وہ بولا

"کیا تم اسی طرح مسکراتی ہوئی بالکنی میں ہر روز نہیں کھڑی رہ سکتیں میری جان —!"

توبہ توبہ

رائین جب انتہائی گوری ہوں، مکھن کی طرح چکنی ہوں ملائی کی طرح نرم ہوں، بجلیوں کی طرح پھڑکتی ہوئی ہوں اور شلوار کا رنگ گہرا نیلا ہو اور پہننے والی اٹھارہ سالہ نوجوان لڑکی ہو۔ اور یہ منظر دیکھنے والا چھبیس ستائیس سالا بھرپور جوان ہو تو ؟؟

سمی نے نئی تراش اور جدید ترین فیشن کا لہریے دار دالے پٹوں کا تنگ فراک تو اپنے جسم پر چڑھا لیا تھا اور جب تنگ پائینچوں والی شلوار سے دھینگا مشتی ہو رہی تھی کہ اچانک ریاض کمرے میں آن ٹپکا۔ ایک لمبی سی "اوئی" کہہ کر سمی نے اپنے آپ کو چھپانے ڈھکنے کی کوشش میں پاس پڑا نائیلون کا دوپٹہ اٹھایا اور رانوں کے گرد لپیٹ لیا،

یہ منظر اور بھی توبہ شکن تھا، کم بخت دوپٹہ بھی گہرا نیلا ہی تھا۔ یہ سمی نامراد کو کچھ خبط بھی تھا کہ میچنگ کرتے ہوئے کپڑے پہنے،

گہرے ہرے، پیلے، اودے، دھانی، لال، گلابی کپڑوں کے ڈھیر کے ڈھیر اس کی الماریوں اور صندوقوں میں بھرے پڑے تھے،

اور اب نیلے نیلے پیرہن میں دھڑکتا تڑپتا جسم لئے وہ "اوئی، اوئی" کر رہی کھڑی تھی مگر یہ سدھ نہ

ہو رہی تھی کہ بازو لٹکتے بر دے کے پیچھے ہی چلی جائے
ذیا من پہلے تو پلکیں جھپکا جھپکا کر یہ تاثل منظر دیکھا
کیا، پھر جیسے ہوش میں آکر جلنے ہی کو تھا کہ سمی،
تیزی سے بولی۔
" اللہ رجو بھائی ــــ قسم اللہ کی بڑے بے
حیا ہو ــــ، ننگے بھی نہیں یہاں سے، توبہ
توبہ ــــ "
وہ جھوٹ موٹ اترائی
ایک دم ریاض پھٹ پڑا
" میں بچہ نہیں ہوں جی جو مجھے رجو رجو کہتی
پھرو، ہاں میں ۔۔۔۔"
بس اس کے الفاظ زبان ہی پر سرک کر رہ
گئے" اور خبر دار ۔۔"
وہ بڑی ہمت سمیٹ کر الفاظ چبا چبا کر بولا
" جو کبھی میرے سامنے توبہ توبہ کہا ــــ ہاں میں کہے
دیتا ہوں جی سمی بیگم ۔۔"
اور ایک دم وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔
" توبہ توبہ ــــ "
وہ بڑ بڑاتا جا رہا تھا۔
" توبہ توبہ ۔ اس توبہ نے تو میری جان لے لی
توبہ توبہ، ہونہہ، بڑی آئیں توبہ توبہ ۔۔"
جیسے بادل اڑتے ہیں، ایسے بہت سارے ماہ و سال

پر لگا کر اڑے اور اس منزل پر پہنچے جب ریاض،
رجو چھ سال کا تھا،

کبھی نیکر پہنتا، کبھی اس سے بے نیاز ہو جاتا، کبھی تو
بالکل ہی ننگا رہتا، کبھی موج میں آکر قمیص ہی گلے میں
لٹکا لیتا۔ اور ان دنوں وہ پورے گھر بھر میں کسی
قدر بے ضرر مانا جاتا۔

اس قدر بے ضرر کہ منجو باجی، جو سارے گھر بھر
کے بچوں سے بھی گئی گذری اور پدی تھیں، بنانے کو بڑے
دالانوں سے لگے بڑے سارے حمام میں جاتیں تو مارے
ڈر کے اسے ساتھ لیتی جاتیں۔

- وہ اپنی نیلی پیلی گولیاں، ہرے لال کنچے لئے جاتا

پر اس دن اتفاق سے لڑائی لڑائی میں وہ سارے کنچے اور
گولیاں ہار گیا اور منجو باجی گرمی سے بوکھلا کر باقاعدگی گاؤن
اٹھائے حمام میں گئیں تو اسے خالی ہاتھ ہی پہریداری
کو جانا پڑا۔

(کم بخت منجو باجی، جانے کاہے کا ڈر لگتا تھا انہیں)
منجو باجی مل مل کر نہاتی رہیں اور وہ دیوار کی طرف
منہ کئے بیٹھا رہا۔

پھر دیوار کو دیکھتے دیکھتے اس کا جی اوب گیا تو اس
نے ذرا سی گردن پھیری۔

باپ رے ،،، وہ بھی منجو باجی کی طرح ڈرنے لگا۔
مگر پھر ہمت سمیٹی۔

منجو باجی شاور کے نیچے کھڑی تھیں۔ دہکتی چمکتی گولائیوں میں سے پانی بھی جیسے سہم سہم کر، جھجک جھجک کر گر رہا تھا۔

سنہری روپہلی چھوٹے بڑے موتی پھر بھی ان کے، ابھاروں پر اٹک ہی جاتے۔

اور پھر ان کے بہت، بہت، بہوت ہلکے بال ساری پیٹھ پر پھیلے ہوئے تھے۔

اور پھر موتی سہمے سہمے، بال بکھرے بکھرے اور ان کی نرم اور ملائم جلد، جو صابن کے رگڑے کھانے سے سرخ پڑ گئی تھی۔

اور پھر ــــ اور پھر ــــ!

اسے یہ منظر خدا کی قسم بہت ہی اچھا لگا، بہت ہی اچھا لگا ــــ!

اسے غصہ آنے لگا کہ اتنا سارا زمانہ وہ گنجے اور گولیاں کھیلتے یوں ہی بتا گیا، الو کا پٹھا ہیں۔

ایک دم تولیہ لینے کو منجو باجی نے ہاتھ بڑھایا اور چہرہ بھی ادھر کو پھیرا۔

رجو اپنی گنجوں جیسی آنکھیں کھولے۔ بنا پلک مارے تصویر حیرت بنا قدرت کی داد دے رہا تھا۔

تولیہ اپنے جسم کے اردگرد لپیٹتی ہوئی وہ ایک ادائے تبسم کے ساتھ بولیں۔

"توبہ توبہ!"

جیسے کسی نے اس کے گریبان میں سے برف کی ڈلی اندر چھوڑ دی ہو۔

وہ چونکا؛

اس طرح چونکا کہ اس کا انگ انگ لرز گیا۔ وہ جی ہار کر یوں ہی بیٹھ گیا۔

منجو باجی با تھنگ گاؤن پہن پہن چکیں تو اسے اٹھاتی ہوئی بولیں۔

"رجو ایسے کسی کو نہاتے ہوئے دیکھنا یا ننگی عورت کو دیکھنا بہت، بہوت بری بات ہے۔ اب نہ دیکھو گے ؟"

اس نے سہم کر منجو باجی کو دیکھا اور بڑی سعادتمندی سے دونوں ہاتھ گاؤن پر مارتے ہوئے کہنے لگا۔

"توبہ توبہ، اب چھے نئیں، توبہ توبہ، اب چھے نئیں، توبہ توبہ ــــ"

اور اس کی نگاہ جھکتی گئی ــ جھکتی ہی گئی ــ

پھر کتنے ماہ و سال گذرے ــ کتنی گرمیاں، کتنے جاڑے ــ

گرمیوں کی ہر گذرنے والی رت رجو کو ایک سال بڑا باتی ــ مگر گھر والے یہ بھی دیکھتے کہ کبھی تو رجو نہانے کی خاطر والا نوں والے حمام کی طرف نہ پلٹا۔ اب یا بھی کیا یہ وہ تھا۔

لڑکا بیس اکیس سال کا ہو بھی جائے تو گھر سے نکال کر تو نہیں پھینک دیتے نا۔

کبھی شادی بیاہ کے ہنگاموں میں مردانہ بالکل ٹھاٹ بکھر جاتا اور ایسے موقعوں پر کوئی ر جوتے کہتا ــــــ،

"میاں تم تو گھر والے ہی ہو، اپنے زنانی حمام میں آکر نہا لیا کرو نا۔ اب یہ تو ہونے سے رہا کہ غیر مردوئے گھروں میں جھانکتے پھریں۔"

تو وہ سوچتا ــــ "توبہ توبہ"

ریاض بی، اے میں آیا، لڑکیاں ایک سے ایک تیکھی اور بڑھ ھائی چور، ــــ !

اور ریاض نے تو اکنامکس میں وہ قابلیت دکھائی تھی کہ پروفیسر صاحب خود ایک دن ابا کے پاس آئے تھے کہ چھوکرے کو لندن بھجوا ہی دیں۔

جب کبھی کسی نے کہا کہ میاں ذرا لڑکیوں کو کچھ سکھا دیا کرو، کچھ بتانے سکھانے سے علم تو گھٹنے سے رہا ــــ،

وہ سوچتا "توبہ توبہ!"

شہر میں کبھی نمائش لگتی اور لڑکیاں اس کے منہ آتیں تو......

اس تصور سے ہی اس کے پسینہ آنے لگتا کہ وہ شمو، گٹو، الانی فلانی کے جھرمٹ میں کھڑا ہے ــــ :

وہ سوچتا ؛ "توبہ توبہ!"

گھر میں کوئی مہمان اترے، یا یہ خود کہیں ماں باپ

کے ساتھ جاتا ــــــ تعارف کی نوبت آتی بھی تو اس کی جھکی جھکی نگاہ اوپر اٹھنے کا نام نہ لیتی۔

لڑکی کو سلام کروں ؟ سوچتا،

" توبہ ، توبہ ــــــ "

بی۔ اے چھوڑ ایم۔ اے پاس کر لیا نوکری والا بھی ہو گیا۔

بھر مٹھی روپے اماں جان کی جھولی میں بھی لا کر ڈالنے لگا ــــــ،

لیکن ــــــ؛

شادی کی بات جب کبھی ماں نے ، خالہ نے ، چھیڑی،

اس نے دل ہی دل میں سوچا،

" توبہ ، توبہ ــــــ "

ریاض محمد عرف رجو اس قدر خوب رو تھا، اتنا دل کش یا پھر بقول سخی اتنا ہینڈسم کہ بس ایک گھڑی دیکھنے کی چیز ــــــ !

" اللہ رجو بھائی اس قدر اسمارٹ ، ایسے اسپورٹنگ ہیں کہ بھئی پوچھو مت ــــــ جانے وہ کیا سوچتے ہیں ــــــ "

لڑکیوں میں کبھی ریاض کا ذکر نکلتا تو بس اس کے حسن پر ــــــ ،

سب کا متفقہ فیصلہ تھا کہ نمبر ایک مغرور ہے،

اپنے حسن کے غرور میں چور ہے۔ تبھی تو کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، وہ نہ یہاں تو ایک ایک "اسپورٹ" لڑکی موجود ہے۔

پھر بھی بہتوں کا خیال تھا کہ اگر کبھی رجو کی نظرِ انتخاب پڑی بھی تو سمی پر ہی پڑے گی۔

وہ نامراد دن رات سیرو ٹن سننے کے خواب دیکھا کرتی، کبھی تنہائی میں رجو مل گیا تو کیا کرے گی؟

ہائے بات کرنی بھی نہ سوجھے گی، تب بھی رجو بھائی ہی کہے گی؟ یا ریاض کہہ کر دم سادھ لے گی۔ مگر قسم لے لو جو ریاض کا سایہ بھی ادھر ادھر کسی نے دیکھا ہو ——

بس کمرے تک اس کی دنیا محدود تھی، وہ تو سمی کے کمرے میں یوں چلا گیا کہ بس اسے ہارڈی کا ناول پورا کرنا تھا، جو جانے کس جھونک میں سمی، اٹھا لے گئی۔

اب بھلا اسے کیا معلوم تھا کہ کتاب لانے کو جانے گا اور وہاں —— !

"توبہ، توبہ —— " وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا —— ؟

ادھر سمی کو وقتی طور پر تو بڑی شرم آئی۔ "اے ہے اللہ آخر رجو بھائی کیا سوچیں گے —— !

ایسے ہی بنا دروازہ بھیڑے کپڑے بدلا کرتے ہیں ۔ ! مگر انہیں حق بھی کیا تھا کہ کسی کے کمرے میں یوں چلے آتے ۔ ! اور ایسی ہی الٹ پلٹ ہزار باتیں وہ سوچتی رہی ۔

پھر ایکا ایکی جگنو کی مانند ایک خیال اس کے ذہن میں چمک اٹھا ۔ کیا ۔ کیا ۔ وہ اب یہ نہ چاہیں گے کہ ان کی ہونے والی دلہن بھی ایسی ہی گوری چمک دار ہو ۔ ؟

مگر رجو نے تو کوئی نوٹس ہی نہ لیا ، ستی کی ٹانگوں کو تو اس نے اتنی بھی اہمیت نہ دی جتنی ایک بار بکری کی ٹانگوں کو دی تھی ۔

نوکر خانے میں ایک دن ماماؤں کے پوتے ایک بکری پکڑ لائے تھے اور سب مل کر اس کا دودھ دو ہنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے ۔

اور بکری تھی کہ بس ٹانگوں سے پوتوں کو جھاڑ رہی تھی ۔

رجو کو بڑی ہنسی آ رہی تھی اور وہ بڑے چاؤ اور انہماک سے دیکھ رہا تھا کہ بکری پچھلی ٹانگوں سے کس مزے سے دولتیاں جھاڑ رہی ہے ۔

ہائے بے چاری ستی ، بکری سے بھی گئی گذری ہو گئی ایسے موقعے پر جو ہوتا ہے وہی ہوا ۔

یعنی بالکل وہی ہوا کہ بے چارہ رجو جو نہیں تھا ، وہ سمجھ لیا گیا اور جو تھا وہ کسی نے نہ سمجھا ،

اور اب تو لوگ باگ رجو میاں کی والدہ کی قسمت پر ترس کھانے لگے تھے کہ کس قدر خوبصورت، سجیلا اور خوب رو، پڑھا لکھا لڑکا اور ــــ

ممی بھی اپنی جگہ صبر کر کے بیٹھ گئیں، اس بات سے کم از کم رجو کو اتنا اطمینان تو ہوا کہ اب کوئی اس کے آگے شادی کی بات چھیڑتا ہی نہ تھا۔

وہ مزے سے آفس جاتا۔ ہینے کے انت پر ڈھیر سارے کپڑے سلواتا، بریل کریم لاتا، بڑھیا پوڈر اور ٹائیاں لاتا اور بس مگن تھا۔

مگر ایک دن کیا ہوا کہ رجو نے آفس جانے کے لئے، اپنی موٹر سائیکل نکالی،

ابھی وہ جانے ہی لگا تھا کہ اسے یاد آیا کہ پین میں وہ انک ڈالنی تو بھول ہی گیا ہے ؟

وہ بجائے پورچ کے پچھلے زنانی دروازے سے آنے لگا کہ یہ راستہ نسبتاً چھوٹا تھا ــ اور اسے جلدی جانا تھا۔

ٹائم کا وہ بیت ہی خیال رکھتا تھا کہ آفس دیر سے نہ پہنچوں ــ ایسے کیریر خراب ہوتا ہے۔ وہ راہداری سے آنے لگا تو صنوبر جھاڑو دیتی جھپک، جھپک ادھر ادھر ہاتھ مار رہی تھی۔

رجو جلدی جلدی قدم اٹھانے لگا کہ کم بخت پین عین اس جگہ گرا جہاں صنوبر کھڑی تھی۔

وہ پین اٹھانے کو جھکا ــ!

اور جب وہ دھیرے دھیرے اوپر اٹھا تو اس کے جسم میں ننھے ننھے سنپولیے سے رینگنے لگے۔ اس کی ناک عجیب سی خوشبو سے بھر گئی۔

یہ خوشبو سراسر صنوبر کے جسم میں سے آرہی تھی اس کے اپنے جسم کی،

جھاڑو لگانے سے اس کا جوان جسم بھبھک اٹھا تھا۔

پسینے کے قطرے یہاں وہاں نمایاں ہو گئے تھے۔ سیدھے ہاتھ کی آستین شانے کے پاس سے پھٹ گئی تھی۔

اور گندمی ہوئی سوجی کی رنگت کا مہکتا دمکتا گوشت جیسے رجو کو زبان چڑھا رہا تھا۔

رجو اتنے برس کا ہو گیا تھا۔ اس نے عورت کو اتنے قریب سے نہ دیکھا تھا۔

اور پھر یہ عورت؟

اسے دیکھ کر تو یہ تو بات کہنے کو جی نہ چاہتا تھا، یہ تو سات پردوں میں چھپی ہوئی عورت تھی، سر پر پلوہ، کمر تک بلاؤز، ٹخنوں تک ساڑی۔

بس ایک شانے کے پاس کا گوشت تھا جو دھوپ میں سورج کی طرح جگمگ جگمگ کر رہا تھا، سورج کو مار دو گولی جی ———!

وہ گوشت ہوا جا رہا تھا اس خوشبو سے۔ جو ظاہر خوشبو نہیں تھی ——— مگر دنیا کے ہر عطر پر بھاری

تھی۔
صنوبر جھاڑو لگاتی اس سرے سے اس سرے
پر چلی گئی،
اس نے مڑکر دیکھا تک نہیں رجو کا سارا وجود جلتے
چولہے پر دھرا توا بن گیا۔
اس نے اپنی پوری طاقت سمیٹ کر پاؤں کمرے کی
طرف بڑھائے اور عثمان کو آواز دے کر ڈوبتے لہجے
میں بولا۔
- عثمان میری موٹر سائیکل اندر رکھ دے میں آفس
نہیں جاؤں گا.... میرا سر اچانک درد کرنے لگا ہے۔
رجو کو شرم تو بہت آئی ـــــ،
مگر اس نے اسے طاق پر رکھنے میں ہی بھلائی
سمجھی اور اماں سے بالکل اسی لہجہ میں شادی کی بات
کہہ دی۔
جیسے نئے سوٹ کا کپڑا خریدنے کی بات کہی ہو۔
"اماں آفس میں دوست احباب بہت مذاق بناتے
ہیں، آپ میری شادی کرہ دیجئے۔"
اماں بے نصیب کو تو اس دن کی آس ہی نہیں تھی
انہوں نے چھوٹتے ہی سمی کا نام پیش کر دیا۔ رجو کو
سمی، نجی، ربی، پچی، کسی سے غرض نہ تھی، اسے بس،
عورت سے غرض تھی۔
ایک خوشبودار عورت سے چھپی ڈھکی عورت
سے ـــــ!

رجو جب دلہن کے کمرے میں داخل ہوا تو کمرہ عطر، لوبان، پھولوں اور طرح طرح کی خوشبوؤں سے مہک رہا تھا

سجے سجائے پلنگ پر سمی ـــ ایک عورت سر جھکائے بیٹھی تھی جو سر سے پیر تک ڈھکی ہوئی تھی، جس کا ایک بال تک بھی نظر نہ آرہا تھا۔

"اچھا ہی ہوا جو یہ ڈھکی ہوئی ہے" رجو نے عجیب بے معنی سی بات سوچی۔

اگر ـــ اگر ـــ مگر اس وقت وہ خود کو اگر مگر کے چکر میں ڈالنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

کتے جیسے کچے گوشت پر لپکتے ہیں، ایسا وہ پلنگ کی طرف لپکا اور ہاتھ بڑھا کر سوئچ آف کر دیا۔

ایسی جان لیوا گرفت تھی کہ سمی چوں بھی نہ کر سکی تھی ـــ؛

مگر دوسری صبح ہر چند کی نڈھال نڈھال سی تھی۔ اس کے چہرے کی جلد بتا رہی تھی کہ وہ سچ مچ ہیروئن بن گئی ہے۔

دوسرے دن جب سمی کی ذرا شرم ٹوٹی تو اس نے کنکھیوں سے رجو کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

مگر پوچھنے سے پہلے اس کے دل کو ذرا دھکا سا لگا ـــ

شادی کے دوسرے دن کیا دولہے ایسے ہی چپ چپ اور بولکھے رہتے ہیں؟

بی کڑا کر کے وہ پوچھ ہی بیٹھی

"آپ کو مجھ سے شادی کا خیال کیسے آیا؟"

پھر تھوڑی دیر خود ہی رک کر بولی۔

"میں سمجھ گئی، آپ نے اس دن مجھے بری حالت میں دیکھ لیا تھا نا؟"

اور وہ بالکل معصومیت سے ہنس دی۔

رجو کو اس سے ایسے بیہودہ سوال کی ہرگز توقع نہ تھی،

اور اگر ایسا ہی وہ ٹانگوں پر عاشق ہو جانے والا ہوتا تو رات بھر بیں اس کی ٹانگیں.... تو ناں خون ہو گئی ہوتیں،

مگر اس نے تو کمرے میں داخل ہوتے ہی لائٹ آف کر دی تھی اور سمی کی ٹانگیں تو کیا چہرہ تک بھی نہ دیکھا تھا۔ اور جو ہونا تھا وہ ہو ہی گیا تھا کہ یہ ہونا ناگزیر تھا۔

مگر — مگر اسے ہر شے میں کسی شے کی کمی کیوں محسوس ہو رہی تھی؟ وہ بے نام سی شے کیا ہو سکتی تھی۔ — کیا — کیا —؟

اتنی جلدی یہ سب ہو جائے گا، وہ تو خواب میں بھی نہ سوچ سکا تھا۔

اسے بڑی شرم آئی جب تھوڑے دنوں بعد سمی نے اسے بتایا کہ وہ باپ بننے والا ہے۔

اسے یہ سب کچھ بڑا عجیب عجیب سا لگا، اور کھوئے

کھوئے ..... پن کا وہ احساس کچھ اور بھی شدید ہوتا گیا۔

سمی شروع دن سے محسوس کر رہی تھی کہ رجو کچھ کھویا کھویا سا لگتا ہے۔ مگر کیوں ؟ یہ وہ کبھی سمجھ نہ پائی۔

وہ اس کمی کو اپنے حسن، اپنے وضع وضع کے نئے لباسوں سے پُر کر دینا چاہتی تھی۔ اور کرتی بھی تھی ——!

ویسے ہی اس کے پاس نت نئے تراش خراش کے لباسوں کے ڈھیر تھے، مگر اس نے اور بھی بڑھیا بڑھیا لباس سلوائے۔

کھلے گلے کے فراک، نیچے گلے کے شرٹ، ایسے گریبان کہ چاند سورج چمکتے نظر آئیں، تنگ بلاؤز سمی ماڈل بن گئی، سہیلیاں مذاق سے کہتیں،

" فیشن پریڈ میں چلی جا، فرسٹ پرائز نہ ملے تو ہم سے کہنا ۔ "

اور اب سمی ماں بن رہی تھی، خوبصورت کپڑے پہننے والی، چمکتا لبھاتا سنگھار کرنے والی سمی ماں بن رہی تھی

" یہ تو زیادتی ہے "

رجو نے خود ہی ایک دن دل میں سوچا، سراسر زیادتی ہے کہ میں اسے بھرپور محبت نہ دوں وہ اسے چاؤ سے گھمانے کو لے جانے لگا۔ پکچر کے بہانے سیر کو لے گیا

ستی کو ذرا دکھ سا بھی ہوا۔

بے نامرد کی ذات، اولاد کی آمد کے آثار نے ہی اتنا بدل دیا، مگر چند دنوں میں ستی کو یہ سب کچھ بھی پھیکا پھیکا اور بناوٹی لگنے لگا۔

لیڈی ڈاکٹر نے اسے سیڑھیاں چڑھنے سے منع کر دیا تھا۔ گرم ٹھنڈی چیزوں کے لئے منع کر دیا۔ اور بھی "دوسری باتوں" کے لئے احتیاط بتائی تھی۔

وہ تو ڈاکٹرنی نے کہا تھا سو رتو عمل کر رہا مگر پھر بھی ستی کو اس لمحہ کی حسرت ہی رہ گئی جب کہ وہ ـــــ ستی کو تو سوچتے بھی شرم آتی تھی

مگر وہ کیسے اپنے دل سے چھپاتی؟ اس کی کتنی ہی سہیلیوں نے شرم اور فخر سے تمتماتے ہوئے چہروں کو سرخ سرخ دوپٹوں میں چھپاتے ہوئے بتایا تھا

"کوئی حد بھی ہوتی وحشت کی ـــــ قسم اللہ کی، آستین تار تار ہوگئی تھی میری"

"اللہ ہی سمجھے ایسے بے شرم سے۔ سارا لباس رنگ گیا" ستی کا لباس عروسی ایسا نیا تھا، جیسے ابھی درزی کے ہاں سے سل کر آیا ہو۔

اور ایک دن رجو باپ بھی بن گیا، میٹرنٹی ہوم کے بیس روپے روزوالے کمرے سے نکل کر جب اس کی ماں نے بتایا ـــــ،

"رجو تجھے لڑکا ہوا ہے"
تو اسے عجیب سا لگا کہ باپ بھی بن گیا مگر لوگوں نے اس کا بچکانہ نام رجو نہ بدلا، پر نہ بدلا۔ بھلا کتنا عجیب لگے۔ گاکہ اس کے بچے کی موجودگی میں اماں اسے رجو کہہ کر پکاریں؛ یہ بہت غلط چیز ہے، اس نے جھلا کر سوچا، بچپن کی یادوں کو بچپن کے ساتھ ہی ختم ہو جانا چاہیئے۔ میں اپنے بیٹے کا کوئی NICK NAME نہیں رکھوں گا، اس نے بہت ہمت کے ساتھ جیسے ایک فیصلہ کر لیا۔

سمی بچے کو لے کر ہاسپٹل سے پلٹی تو زرد زرد سی تھی، تھکی ہاری، پتہ نہیں کا ہے کی تھکن اسے گھیرے بیٹھی تھی، مگر اس کے چہرے پر نور سا چھا گیا تھا۔

یہ زردی اس زردی سے مشابہ تھی جیسے چاند کے گرد زرد ہالہ ہو، رجو کو سمی اب پہلے سے کہیں زیادہ حسین لگتی تھی۔

اس کے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، بات چیت تک کرنے کے انداز میں ایک وقار اور بانکپن پیدا ہو گیا تھا۔ وہ جب رجو کی طرف بیٹھ کر کے بچے کو دودھ پلانے بیٹھتی تو رجو کو اس کے مڑ مڑ کے بات کرنے کا انداز بہت ہی بھلا لگتا۔

کیا عورت بچہ پیدا کرنے کے بعد زیادہ خوبصورت لگتی ہے، یا صرف اسی کو لگ رہی ہے؟"

بچہ بڑی جلدی جلدی بڑھ رہا تھا۔ پہلے جو کرتے اسے ڈھانپ دینے کو کافی ہو جاتے تھے اب اس کی

ٹانگوں کو ڈھانکنے میں بھی ناکام رہتے تھے۔

- - - - - - - - - - - - - - - - - - -

بچے کی
کی ہر مصروفیت کے ساتھ ساتھ سمی نے کام کاج میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔

کبھی تو وہ مشین پر بیٹھ کر کھر کھر کپڑے سی رہی ہوتی، کبھی بچے کے کپڑے دھوتی نظر آتی، رجو اسے اتنے لگن سے کام کرتا دیکھ کر ہنس کر پوچھتا۔

"سمی تم نے اپنے ذمہ اتنے سارے کام کیوں لے رکھے ہیں؟"

سمی مسکرا کر جواب دیتی

"اپنے بچے کا کام خود کرنا مجھے بڑا اچھا لگتا ہے۔"

"مگر اس طرح تم نے خود اپنا خیال رکھنا چھوڑ دیا ہے نا، کبھی تم سوچتی ہو کہ پہلے تم کس طرح ماڈل بنی پھرتی تھیں اور خوشبوؤں میں بنائی رہتی تھیں!"

سمی کا حلق سوکھنے لگتا۔ جی چاہتا کہہ دے

"تب بھی آپ نے کون جان نچھاور کر دی تھی مجھ پر، میں تو ایسے ہی نصیب لائی تھی کہ ساری خوشیاں نصیب ہوتے بھی دل میں بے نام سی کسک پالا کروں۔"

خود رجو نے بھی تو محسوس کیا تھا کہ وہ سمی کو ٹوٹ کر پیار نہیں کرتا۔ اس کا کوئی انداز جان چھڑکنے والا نہیں کہلایا جا سکتا۔

وہ خود مجبور تھا، وہ ایسے جال میں پھنسا تھا جو بظاہر جال نہ تھا مگر پھر بھی وہ نکل نہ پاتا تھا۔

اس دن رجو آفس سے لوٹا تو سمتی خلافِ معمول بری طرح چڑی ہوئی تھی۔

آنگن میں منّے نے خوب ساری مٹی کا ڈھیر کیا ہوا تھا اور ہر طرف کھلونے ہی کھلونے۔ اور وہ خود اس سمتی اور کپڑے دھول میں اٹا بالکل سادھو مہاتما لگ رہا تھا۔

سمتی اپنے نصیب کو کوس رہی تھی۔

"کنوارپن کی زندگی بھی کیا زندگی ہوتی ہے خداوند—کوئی فکر نہ جھمیلا، یہاں تو کمبخت اٹھاتے گھو گھٹ ہی سے اولاد نصیب میں بندھ گئی۔

سارے مزے ہوا ہو گئے۔ گو موت کرو، جھاڑو دھنک کرو، نہلاؤ دھلاؤ، کچھ بھی کر مرو مگر یہ حرامزادہ گندے کا گندہ، اگر پہلے سے ذرا بھی خیال آیا ہوتا تو ایسی شادی کو دور ہی سے سلام کر دیتی"

وہ چڑچڑ کر جھاڑو سے دھول اڑاتی جاتی تھی اور منّے پر چڑتی جاتی، ایک دم ریا من گھر میں داخل ہوا، وہ چڑے جا رہی تھی۔

"کم بخت نصیبوں میں جو سوچا بھی نہ تھا، وہ آگیا کبھی کا ہے کو جھاڑو تھامی ہوگی، یہ حرامزادہ تو مجھے کھا کر ہی چین لے گا۔"

رجو ہنس کر اسے چڑانے کو بولا۔

"بس ایک ہی میں گھبرا گئیں، خود ہی نے اسے بگاڑا ہے، یاد ہے کیسے کیسے چاؤ چونچلے تھے اس کے۔ ایک، سال میں گالیوں تک نوبت پہنچ گئی۔"

اور وہ آگے بڑھا اور بولا

"لاؤ جھاڑو ادھر دیدو۔ ماشاء اللہ سے گھر میں بہت نوکر ہیں — تمہی نے ہر کام اپنے ذمہ لے لیا ہے تو اس کا کیا علاج؟"

سمی نے تیزی سے ہاتھ پیچھے کر لیا اور خود بھی پرے ہٹ گئی۔

"ہٹئے بھی، اب آپ جھاڑو کو بھی ہاتھ لگائیں گے؟"

وہ جھاڑو والا ہاتھ پیچھے کر کے، یونہی کھڑی رہ گئی۔

رجو گرتے گرتے بچا۔

اس کے جسم میں ہزاروں بڑے چھوٹے سپنو لیے کلبلانے لگے۔

ہمیشہ تجی سنوری، خوشبوؤں میں ڈوبی۔ بڑھیا لباس میں ملبوس رہنے والی سمی آج ایک پرانی دھرانی ساڑی میں لپٹی کھڑی تھی۔ بلاؤز کی آستین شانے کے پاس سے مسک گئی تھی گرد سے بچنے کو اس نے پلو سر کے گرد لپیٹ لیا تھا۔

جھاڑنے اور الجھنے کی وجہ سے اس کے جذبات میں ابال سا آگیا تھا اور گردن اور چہرے پر پسینے کے شبنمی قطرے پھوٹ آئے تھے۔

اور ایک خوشبو، جو خوشبو تھی بھی اور نہیں بھی، اس کے جوان اور بھرپور جسم سے نکل نکل کر رجو کے نتھنوں میں ایسے پہنچ رہی تھی کہ ہر لمحہ وہ گبر بڑنے کو ہو رہا تھا۔

وہ جیسے خواب میں بڑھا اس کے قریب ہو کر پھٹے بلاؤز میں سے جھانکتے گوشت کو یوں دیکھنے لگا، جیسے سوچ رہا ہو کہ آستین میں سورج کیسے آ سکتا ہے ـــــ؟

سمی تڑپ کر پیچھے ہٹی، ایک دم اسے اپنی حیثیت کا خیال آیا، بڑے محجوب اور شرمسار لہجہ میں بولی۔

"میں نے صفائی کے خیال سے یہ پھٹے کپڑے پہن لئے تھے، سوچا تھا جلدی جلدی جھاڑ جھوڑ کر کپڑے بدل لوں گی، آپ چلے آئے، آج تو آپ وقت سے کچھ پہلے ہی چلے آئے ـــ...

ہائے! مجھے کتنی شرم لگ رہی ہے، بھلا آپ کیا سوچتے ہوں گے"

اور وہ جھاڑو پھینک کر بھاگنے لگی۔

رجو نے لپک کر اسے باہنوں میں سمیٹ لیا ـــ،

مدہوش کر دینے والی خوشبو کا ایک ریلا اس کی ناک میں گھس گیا۔

اور وہ بالکل وحشیوں کی طرح سمی کو جھنجھوڑنے لگا۔

کبھی وہ اس کے گال پر کاٹ کھاتا، کبھی ہونٹوں کو اس بری طرح چوسنے لگتا کہ سحی کو لگتا کہ اس کا دم نکل جائے گا۔

"توبہ توبہ"

سحی ہانپ کر بولی

"کچھ خیال تو کیجئے آنگن میں اور پھر تھا"

رجو نے دیوانوں کی طرح جھپٹ کر اس کے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں سے چپکا لیا۔

وہ ایک ایک کر کے اس کے کپڑے نوچ نوچ کر پھینکتا جارہا تھا۔ دھول مٹی میں اٹی سحی نے بڑی بے بسی سے کہا۔

"توبہ توبہ رجو...."

مگر ریاض نے اسے بات کرنے کی مہلت بھی نہ دی اور اسے نوچتا کاٹتا ہوا بولا۔

"مجھے آگے سے رجو نہ کہنا — میں ریاض ہوں ہوں، تمہارا شوہر — ...

میں بچہ نہیں ہوں، مرد ہوں سمجھیں نا؟

میں رجو نہیں ریاض ہوں ...

اور میں جو چاہے وہ کر سکتا ہوں سحی میری جان میری عورت....

سات پردوں میں چھپی عورت، میں اتنی قدرت

رکھتا ہوں کہ تمہیں اپنے ہاتھوں ننگا کر سکوں،"
ستی مارے شرم کے توبہ توبہ بھی نہ کہہ سکی،
اس کا شوہر ریاض اسے اتنی مہلت تو دیتا ——
اس کے ہونٹوں پر تو ہونٹوں ہی کا قفل
پڑ گیا تھا۔

قابلِ مُطالعہ کتابیں!

حسن و صحت	رابعہ سعید	۹/- روپے
گھریلو چٹکلے		۹/- 〃
آرائشِ گیسو	ثریا ستارہ	۹/- 〃
پانی سے علاج	سعید اے شیخ	۹/- 〃
گنجینۂ اقوال	〃 〃 〃	۹/- 〃
تمباکو نوشی یا جاں نوشی	〃 〃 〃	۹/- 〃
دل کی حفاظت کیجیے	〃 〃 〃	۹/- 〃
ترقی کی راہ پر	ڈیل کارنیگی	۱۰/- 〃
کامیابی کے راز	〃 〃	۹/- 〃
ستمبر کا چاند	قرۃ العین حیدر	۹/- 〃
دلربا	〃 〃	۹/- 〃
خوشبو وفا کی	فریدہ حق جنجو	۱۵/- 〃
جینے کی آرزو	〃 〃 〃	۱۰/۵۰ 〃
مینا	〃 〃 〃	۱۵/۷۵ 〃
نیتو	〃 〃 〃	۱۵/- 〃
تجھ بن تیری پیار وے	ذکاء الزب رباب	۱۰/۵۰ 〃
شوگراں کی چاندنی	〃 〃 〃	۱۰/۵۰ 〃
منزلیں کھو گئیں	〃 〃 〃	۱۳/۵۰ 〃
سیاہ کار	〃 〃 〃	۱۵/- 〃
ہم بھی تیرے دل بھی تیرا	〃 〃 〃	۱۵/- 〃
نوریا	خدرا بیگ	۱۵/- 〃
پارہ	شہناز بٹ	۱۸/- 〃
سیلما	بلقیس ظفر	۱۵/- 〃
حیا	کوثر ضمیر	۱۵/- 〃
فشا نیل	〃 〃	۱۵/- 〃
میرے اپنے	زرینہ ضمیر	۱۲/- 〃
کنول رانی	〃 〃	۱۴/- 〃
اور بھی دکھ ہیں	〃 〃	۱۲/- 〃
ہیلس کا سحرا	پروین شریف	۱۵/- 〃

رابعہ بُک ہاؤس ◎ بخشی مارکیٹ، انارکلی لاہور

ستمبر کا چاند	قرۃ العین حیدر	۹ -
دلربا		۶ -
[illegible] کا بوجھ	وجیدہ تبسم	۲۱ -
کیسے سمجھاؤں		۹ -
[illegible]		۱۲
[illegible]	[illegible]	۱۰ ۵۰
[illegible]		۳ ۵۰
[illegible]		۲
[illegible]		۶ -
[illegible]		۵ -
[illegible]	[illegible]	۶
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	۵ -
[illegible]	[illegible]	۵

رابعہ بک ہاؤس بخشی مارکیٹ [illegible]